کتاب نما کا خصوصی شمارہ

مغیث الدین فریدی

شخصیت اور ادبی خدمات

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

مغیث الدین فریدی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ

ظہیر احمد صدیقی

ماہنامہ "کتاب نما" جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر:۔ شاہد علی خاں

مہمان اڈیٹر:۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

قیمت سالانہ ۵۵/- روپے
فی شمارہ ۶/- روپے
غیر ممالک کے لیے ۳۲۰/- روپے

اس شمارے کی قیمت ۴۵/- روپے

تقسیم کار:-

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

بار اول ستمبر ۱۹۹۴ء

قیمت: =/45

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

فہرست

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ	مہمان مدیر	۵
سوانحی خاکہ	مغیث الدین فریدی	۷
انٹرویو	عقیل احمد	۹
حرفِ اول	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۱۸
فریدی کی شعری حسیات	پروفیسر قمر رئیس	۲۰
کفر تمنا یا اعتراف ایمان	ڈاکٹر شریف احمد	۲۴
سرِ دلبراں اور حدیثِ دیگراں کا شاعر	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۲۹
میں اپنی بھی آواز ہوں سب کی بھی صدا ہوں	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۳۷
فریدی صاحب اور تاریخ گوئی	ڈاکٹر محمد فیروز	۴۵
کفر تمنا کا شاعر	مظہر امام	۵۶
فریدی صاحب کی تضمینیں	سراج اجملی	۶۴
کفرِ تمنا کی روشنی میں	محمد نفیس حسن	۶۸
تضمین بر غزل مخدوم محی الدین	مغیث الدین فریدی	
غزل بخطِ شاعر	مغیث الدین فریدی	۷۵
انتخاب غزلیات کفر تمنا	عقیل احمد	۷۷

مہمان مدیر
ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
پروفیسر شعبۂ اردو،
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

اداریہ

ڈاکٹر مغیث الدین فریدی جہاں ایک بڑے شاعر ہیں وہاں خدا نے ان میں تنقیدی صلاحیت بھی ودلیعت کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ ایک اچھے استاد ہیں۔ ذہانت کا یہ حال ہے کہ وہ واقعات جن کو تاریخ کے اوراق بھی بھلا چکے ہوں ان کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں وہ ملکہ حاصل ہے کہ کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہوگا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور شاعری میں ان کے فن کو اکثر اس عہد کے اساتذہ نے تسلیم کیا ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام 'کفر تمنا' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مختصر مجموعہ عہد حاضر کی ایسی آواز ہے جس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ عہد حاضر کا کرب۔ سماج کی بے چینی۔ سیاست کی منافقانہ پالیسی، ان سب کا اظہار غزل کے پیرایہ میں جس خوش اسلوبی سے ہوا ہے اس نے غزل کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان کا لب و لہجہ شعر میں ایک کیف پیدا کر دیتا ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ آج فریدی صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ خصوصی شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے شاہد علی خاں صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اہل ادب اور اہل علم کے ادبی کارنامے پیش کر کے ہم کو یاد دلایا کہ ان سے کبھی زمانہ خالی نہیں رہتا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ یہ شمارہ فریدی صاحب کے منصب کے شایانِ شان نہیں ہے مگر یہ کیا کم ہے کہ جو لوگ اس محفل میں شریک ہیں ان کے نام سند کے لیے کافی ہیں۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا مختصر مضمون خود شاعر کے لیے سند ہے۔ اس مضمون میں ایک ناقد کی نظر کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کا اظہار بھی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کے مضمون نے فریدی صاحب کی شاعری کے ان گوشوں کو نمایاں کیا ہے جن کی طرف عام طور سے لوگوں کی نظر یں نہیں جاتیں۔ ڈاکٹر شریف اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے جس خوبی کے ساتھ فریدی صاحب کی شخصیت کو ان کے کلام کی روشنی میں نمایاں کیا ہے اس نے اس شمارہ کے

وقار میں اضافہ کر دیا۔ ڈاکٹر محمد فیروز نے فریدی صاحب کی تاریخ گوئی کے پہلوؤں کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ "کفر تمنا کا شاعر" مظہر احمد کا مضمون فریدی صاحب کے شاعرانہ نکات کی نشان دہی کرتا ہے جو شاعر کی انفرادیت کی ضامن ہیں۔ فریدی صاحب کی ایک شناخت ان کی تضمین بھی ہیں۔ سراج اجملی نے تضمین کی بنیادی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فریدی صاحب کی تضمین نگاری پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ 'کفر تمنا' کی روشنی میں نفیس حسن کا مضمون فریدی صاحب کے شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہے۔ آخر میں کفر تمنا کا مختصر انتخاب قارئین کی دلچسپی کا سبب ہوگا۔ ابتدا میں فریدی صاحب سے عقیل احمد کا انٹرویو فریدی صاحب کی پُر کشش شخصیت کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ شمارہ اہل ادب سے خراج تحسین حاصل کرے گا۔ اس کے لیے پھر ایک دفعہ شاہد علی خاں کو مبارک باد دیتا ہوں اور شکر گزار ہوں اپنے عزیز طالب علم عقیل احمد کا کہ انھوں نے اس سلسلہ میں میری مدد کی۔

۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء

سوانحی خاکہ

نام : مغیث الدین فریدی
ولدیت : عظیم الدین فریدی
تاریخ پیدائش : یکم مئی ۱۹۲۶ء
مقام : فتح پور سیکری (آگرہ)
تعلیم : بی۔ اے سینٹ جانس کالج، آگرہ۔ ۱۹۴۶ء
ایم۔ اے (اردو) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔ ۱۹۴۸ء
پی۔ ایچ۔ ڈی دہلی یونی ورسٹی ۱۹۷۵ء (موضوع: اردو شاعری میں قومیت کا تصور)
ملازمت: استاد شعبۂ اردو، فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ ۱۹۴۸ تا ۱۹۶۲ء
استاد شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی ۱۹۶۲ تا ۱۹۹۱ء

مطبوعات و مقالات:

انتخاب دیوانِ غالب، مع تنقیدی مقدمہ و تشریح اشعار، انتخاب مثنویاتِ اردو مع مقدمہ
انتخاب قصائد اردو مع مقدمہ۔ قومی یک جہتی اور اردو شاعری، اقبال کا شاہین سیدامان نثار
غالب کے پسندیدہ اوزان۔ انتخاب غزلیاتِ حافظ مع فرہنگ بلاغت اور عروض
کے تشریحی حوالے۔ میکش اکبرآبادی۔ کفر تمنا (شعری مجموعہ)

سمینار اور ادبی جلسوں میں شرکت:

انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس (لکھنؤ) ۱۹۴۸ کل ہند اردو کانفرنس، انجمن ترقی اردو
علی گڑھ (۵۴-۱۹۵۳ء) انجمن اساتذہ اردو، جامعاتِ ہند کی کل ہند کانفرنس (دہلی ۱۹۶۶ء)
آزادی کے بعد اردو ادب کا جائزہ سمینار شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی ۱۹۶۷ء اردو کے
عصری ادب پر ایک مذاکرہ ۱۹۶۹ء غالب صدی سمپوزیم، آگرہ یونی ورسٹی، آگرہ ۱۹۶۹ء
سمپوزیم حضرت غریب نوازؒ اجمیر شریف، سمپوزیم حضرت نظام الدینؒ محبوب الٰہی، غالب
سمینار، ایوانِ غالب، دہلی سمینار داغ دہلوی، اردو اکادمی، دہلی۔

علمی اداروں اور ادبی انجمنوں کی رکنیت :۔

سکریٹری انجمن حدیقتہ الشعر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ (۴۸۔۱۹۴۷ء) سکریٹری انجمن ترقی اردو، آگرہ (۶۲۔۱۹۵۰ء) بزمِ اقبال آگرہ (۶۳۔۱۹۴۹ء) بورڈ آف اسٹڈیز آگرہ یونی ورسٹی (۶۲۔۱۹۶۱ء) بورڈ آف اسٹڈیز کانپور یونی ورسٹی ۸۱۔۱۹۷۹ء بورڈ آف اسٹڈیز شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی۔ مجلس منتظمہ جامعۂ اردو علی گڑھ، امتحان کمیٹی جامعہ اردو، علی گڑھ، مجلس تعلیمی، جامعہ اردو، علی گڑھ۔ ایم۔فل کمیٹی، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، اڈیٹر رسالہ شفق آگرہ (۶۲۔۱۹۴۸ء)

اردو مجلس اور اردو سروس آل انڈیا ریڈیو، دہلی اور لکھنؤ سے متعدد ادبی موضوعات پر تقاریر، ریڈیو کے مشاعرے اور کلام شاعر کے ریڈیو پروگرام میں غزلیں اور نظمیں پیش کرتا رہا ہوں۔

انعام اور اعزاز :۔

چٹرجی نواب کپ اردو ڈبیٹ کرائسٹ چرچ کالج، کانپور ۱۹۴۱ء

بشیر غوری کپ اردو ڈبیٹ حلیم مسلم کالج، کانپور ۱۹۴۱ء

آلِ نبی ٹرافی اردو ڈبیٹ آگرہ کالج، آگرہ ۱۹۴۲ء کالجوں کے ان علمی مباحثوں میں ٹرافی اور کپ جیتنے کے علاوہ انفرادی انعامات بھی حاصل کیے۔

کل ہند انعامی مقابلۂ غزل گوئی سینٹ جانس کالج، آگرہ ۱۹۴۳ء میں پہلا انعام حاصل کیا۔

کل ہند انعامی مقابلۂ غزل گوئی، آگرہ کالج، آگرہ ۱۹۴۳ء میں پہلا انعام حاصل کیا۔

سینٹ جانس کالج کے انعامی مقابلۂ فی البدیہہ غزل گوئی کا پہلا انعام ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک لگاتار حاصل کیا۔

۱۹۸۷ء میں اردو اکادمی، دہلی نے شاعری کے ایوارڈ سے نوازا۔

موجودہ پتا :۔ مغیث الدین فریدی، ام، جی ۶/۱۰ گنگا وہار (کے۔ڈی۔اے) جاج مئو۔کانپور ۲۰۸۰۱۰

عقیل احمد

انٹرویو

عقیل احمد : فریدی صاحب! آپ کی شخصیت اور علم وفضل کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں مگر آپ کے حالاتِ زندگی سے ناواقف ہیں۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اپنے خاندان اور وطن کے متعلق ارشاد فرمائیں۔

مغیث الدین فریدی : فتح پور سیکری میں یکم مئی ۱۹۲۶ء کو حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے خاندان میں پیدا ہوا۔ میرے والد عظیم الدین فریدی ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۳۰ء تک فتح پور سیکری سے باہر رہے۔ ۱۹۳۰ء میں پینشن لے کر فتح پور سیکری آئے۔ وہ خاندان کے ہر لڑکے کو بہتر سے بہتر تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی باقی زندگی وقف کر دی۔ ۱۹۳۴ء میں سب کو آگرہ لے کر آئے۔ ایک مکان کرایہ پر لیا گیا۔ پرائیویٹ ٹیوٹر کی تلاش ہوئی اور ابتدائی تعلیم کے بعد وکٹوریہ ہائر اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ میں نے وکٹوریہ اسکول سے ہائی اسکول کا امتحان ۱۹۴۰ء میں پاس کیا۔

عقیل احمد : ہم کو یہ تو معلوم ہے کہ آپ کی تعلیم کا ایک زمانہ علی گڑھ میں گزرا مگر آگرہ کے زمانہ پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈال سکیں تو ممنون ہوں گا۔

فریدی : میں انٹر میں آگرہ کالج کا اور بی۔ اے میں سینٹ جانس کالج، آگرہ کا طالب علم رہا ہوں۔ طالب علموں کی ہمت افزائی کے لیے آگرہ کالج اور سینٹ جانس کالج، آگرہ میں ہر سال غزل گوئی کے انعامی مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ان انعامی مقابلوں میں ایک دلچسپ اضافہ مولانا حامد حسن قادری صاحب نے یہ کیا تھا کہ سینٹ جانس کالج کے سالانہ مشاعرہ کے دو دن قبل ایک فی البدیہہ مقابلۂ غزل گوئی ہوتا تھا۔ اس میں شریک ہونے والے طالب علم شعرا ایک نیم دائرہ کی شکل میں کرسیوں پر بیٹھتے تھے ان کے سامنے ایک میز پر ایک ٹائم پیس رکھ دی جاتی تھی۔ قادری صاحب ٹھیک ۳ بجے مصرع طرح کا اعلان کرتے تھے اور ایک گھنٹے کے بعد یہ ہدایت کرتے تھے کہ مقابلہ کا وقت ختم ہوا۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ کا وقت اور ملتا تھا جس میں ہر شاعر

اپنے اشعار پر نظر ثانی کر کے دوسرے کاغذ پر صاف لکھ کر قادری صاحب کے حوالے کر دیتا تھا۔ قادری صاحب ان غزلوں کو حضرت میکش اکبرآبادی اور حضرت سیماب اکبرآبادی کے پاس بھیجتے تھے۔ پہلے اور دوسرے انعام کی غزلوں کا انتخاب ان حضرات کے متفقہ فیصلوں سے ہوتا ہے۔ کالج کے سالانہ مشاعرہ میں انعامات تقسیم کر دیے جاتے تھے

ہائی اسکول میں میرے استادِ محترم مولوی سید حامد علی نے اردو غزل اور فارسی غزل کا درس بڑے دلنشیں انداز سے دیا۔ اس وقت ٹوٹی پھوٹی غزلوں کی اصلاح بھی کی اور ہمت بڑھائی۔ سینٹ جانس کالج کے انعامی مقابلے میں شرکت کے لیے آمادہ کیا۔

آگرہ کالج میں محمد طاہر فاروقی صاحب میرے لیے نہ صرف کالج کے اردو اور فارسی کے استاد تھے بلکہ میرے مربی اور سرپرست بھی تھے۔ میری تعلیم اور تربیت ان کی شفقت اور تنبیہہ کی مرہونِ منت ہے۔ فاروقی صاحب آگرہ میں اپنی ذات سے انجمن تھے۔ ان کی شخصیت کی دلآویزی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آگرہ میں جب کبھی ایسا مشاعرہ یا جلسہ ہوتا تھا جس میں معاصرانہ چشمک کی بنا پر صدارت کے مسئلہ پر بدمزگی اور بے لطفی پیدا ہونے کا امکان ہوتا تھا تو اس کا حل یہی نکلتا تھا کہ پروفیسر طاہر فاروقی کی صدارت کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور ہر شخص مطمئن ہو جاتا تھا۔ فاروقی صاحب اپنی تمام شفقت اور مرحمت کے باوجود بڑے سخت گیر استاد اور سرپرست تھے، میری شاعری کے معترف تھے۔ مشاعروں میں شرکت کی اجازت بہت کم دیتے تھے۔ میں اپنی کہی ہوئی غزل رات کو ان کی میز پر رکھ دیتا تھا۔

آگرہ کے ادبی جلسے اور مشاعرے ادبی ذوق کو نکھارنے اور شوقِ شعر گوئی کو بڑھانے میں بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ سیماب لٹریری سوسائٹی کے ماہانہ جلسے بزم نظیر کا سالانہ ادبی میلہ، بزم اقبال اور دوسری ادبی انجمنوں کے جلسے اعلا ادبی معیار اور خوش مذاقی کے آئینہ دار تھے۔ ان جلسوں میں سیماب اکبرآبادی، اخضر اکبرآبادی، میکش اکبرآبادی، اعجاز صدیقی محمد طاہر فاروقی، رعنا اکبرآبادی اور صبا اکبرآبادی کی شرکت سے جلسوں کے ادبی وزن اور وقار میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

بیرونی شعراء جو آگرہ کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً تشریف لاتے تھے اور جن کے آنے سے گرمیِ محفل بڑھ جاتی تھی ان میں سے یہ نام میرے حافظے میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، قمر بدایونی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، روش صدیقی، مجاز لکھنوی، جاں نثار اختر، نشور واحدی، معین احسن جذبی، راز مرادآبادی، شعری بھوپالی اور شکیل بدایونی

شاید اس امر کی طرف اشارہ نامناسب نہ ہو کہ میری جامعۂ اردو ادارہ سے وابستگی ۱۹۴۳ء سے ہے۔ بزم اقبال آگرہ کے نائب معتمد کی حیثیت سے محمد طاہر فاروقی صاحب رجسٹرار اور بانی جامعۂ اردو کے کاموں میں ۱۹۴۶ء تک حصّہ لیتا رہا ہوں۔ ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا لیکن جامعہ سے دلچسپی برقرار رہی۔ ۱۹۴۸ء میں جب محمد طاہر فاروقی صاحب آگرہ کی ملازمت ترک کر کے پاکستان جانے لگے اور جامعۂ اردو کو علی گڑھ منتقل کیا گیا تو جامعۂ اردو کے دفتر کے سامان کو آگرہ سے علی گڑھ پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔

سینٹ جانس کالج میں تقرر ہونے کے بعد جامعہ اردو کے امتحانات کے آگرہ سنٹر کا اہتمام ۱۹۶۱ء تک میری ہی نگرانی میں ہوتا تھا۔ بزم اقبال آگرہ کے رکن کی حیثیت سے جامعہ اردو کی مجلس عام میں بزم اقبال آگرہ کی نمائندگی اب تک کر رہا ہوں۔

عقیل احمد: آپ نے آگرہ کے زمانہ طالب علمی کا تو ذکر کیا مگر علی گڑھ میں بھی تو آپ نے طالب علمی کا زمانہ گزارا ہے۔

فریدی: سینٹ جانس آگرہ سے ۱۹۴۶ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد میں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ان حالات میں بڑا جرأت مندانہ قدم تھا لیکن محمد طاہر فاروقی صاحب نے دل بڑھایا اور علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی صاحب کی مشفقانہ سرپرستی نے میری مشکل آسان کر دی۔ (۴۸۔۱۹۴۷ء) میں شعبۂ اردو کی انجمن حدیقۃ الشعر کا سکریٹری مقرر ہوا۔ اس انجمن کے اہتمام میں دو جلسے کیے پہلا جلسہ جگر مراد آبادی کی صدارت میں ہوا اور دوسرے جلسے کے صدر مولانا حسرت موہانی تھے۔ یہ زمانہ میری زندگی کا سنہرا دور ہے۔ علی گڑھ ادبی اقدار شایستگی کی علامت تھا۔ یہاں سے جو لوگ نکلے ان کا شمار ملک کی سربرآوردہ شخصیتوں میں ہوا۔ کہا جاتا تھا کہ جس شخص نے یونین کے پلیٹ فارم پر تقریر کر دی وہ پارلیمنٹ میں بے جھجک تقریر کر سکتا ہے۔ یہاں مجھے سیاسی، مذہبی، ادبی شخصیتوں کو دیکھنے اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان طالب علموں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا جو بعد کو ہندو پاک میں بلند منصب پر فائز ہوئے۔ یہاں اساتذہ میں رشید احمد صدیقی، مسعود حسین خاں، ڈاکٹر عزیر، سید ظہیر الدین علوی سے شرف تلمذ حاصل ہوا شعبۂ اردو کے علاوہ دوسرے شعبوں میں علم و فضل کی دیو ہیکل شخصیتیں درس و تدریس میں مصروف تھیں۔ میری مراد ڈاکٹر ہادی حسن، مولانا ضیاء احمد بدایونی، محمد حبیب، خواجہ منظور حسین، بابر مرزا، مولانا عبدالعزیز میمن وغیرہ سے ہے۔

عقیل احمد: آپ کی ملازمت کا آغاز کہاں سے ہوا۔ دہلی میں آپ کی آمد تو بہت بعد کو ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی روداد دلچسپ ہو گی۔

فریدی: جولائی ۱۹۴۸ء میں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے سینٹ جانس کالج آگرہ

میں تقرر ہوا۔ یہ دور بڑا پُر آشوب تھا۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ آگرہ سے پاکستان جانے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ شہر کے ادبی جلسے اور کالجوں کے مشاعرے بند ہو چکے تھے۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آنے لگے۔ کالج کی انجمن ترقی اردو کی ادبی سرگرمی شروع ہو گئی۔ میں اگست ۱۹۶۲ء تک سینٹ جانس کالج سے وابستہ رہا۔ اس دوران سالانہ ادبی جلسوں اور مشاعروں کے علاوہ تین ادبی جلسے ایسے ہوئے جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ مولانا حامد حسن قادری صاحب کے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد شعبۂ اردو سینٹ جانس کالج کی جانب سے جو الوداعی جلسہ کیا گیا اس میں مقامی اُدبا اور شعرا کے علاوہ شعبۂ اردو علی گڑھ سے مسعود حسین خاں، سید ظہیر الدین علوی، ڈاکٹر محمد حسن اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے شرکت کی۔ اس جلسہ میں ان تمام حضرات نے حامد حسن قادری صاحب کی ادبی خدمات کا ذکر اور ساتھ ہی ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے کارناموں کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف کیا۔

دوسرا جلسہ جگر مراد آبادی کے اعزاز میں ہوا۔ اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ جلسہ کی صدارت حضرت میکش اکبرآبادی نے فرمائی۔ جگر صاحب کی خدمت میں شعبۂ اردو کی جانب سے سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد جگر صاحب نے دو غزلیں والہانہ انداز میں پیش کیں اور جلسہ ختم ہو گیا۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ مشاعرہ کیوں نہیں ہوا۔ اسی انداز کا بغیر مشاعرہ کا جلسہ فراق گورکھپوری صاحب کی آمد پر ہوا۔ فراق صاحب شعیب محمدیہ کالج کے مشاعرہ کے سلسلے میں آگرہ آئے ہوئے تھے۔ مشاعرہ کے دوسرے دن سینٹ جانس کالج میں ان کو مدعو کیا گیا۔ کالج ہال میں فراق صاحب نے تقریر کی اس کے بعد آدھ گھنٹے تک اپنا کلام سنایا اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ فراق صاحب کی تقریر اور شاعری کا لطف و اثر کئی دن تک کالج میں موضوع سخن بنا رہا۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں سینٹ جانس کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو کر دہلی آگیا۔ یہاں شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں استاد کی حیثیت سے پوسٹ گریجویٹ (ایوننگ) کلاسز میں درس دینے لگا۔ ۱۹۹۱ء میں ریڈر کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوا۔

دہلی میں شبینہ کلاسز کی مصروفیت کی وجہ سے شہر کے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہونے کا موقع کم ملا، پھر بھی اردو اکیڈمی، دہلی کے دو ایک مذاکروں میں شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ ایوانِ غالب کے غالب سمینار میں غالب کی تاریخ گوئی پر مقالہ پڑھا۔ خواجہ ہال کے جلسوں میں حضرت محبوب الٰہی اور حضرت امیر خسرو

کے عرس کی محفلوں میں منقبت اور تاریخی قطعے پیش کیے۔
شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی میں انجمن اساتذۂ اردو جامعاتِ ہند کے افتتاحی سمینار میں نصاب کے مسائل پر مقالہ پیش کیا۔ شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے زمانۂ صدارت میں بہت فعال رہا۔ مختلف شخصیتوں نے وقتاً فوقتاً شعبۂ اردو کے جلسوں کو زینت بخشی ان جلسوں کی یاد ابھی تک دل سے محو نہیں ہوئی ہے۔ ان میں سب سے نمایاں اور ممتاز مقام نظام خطبات کے جلسوں کو حاصل ہے۔ ان جلسوں میں ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر غلام السیدین، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، جناب آنند نرائن مُلّا جیسے مشاہیر نے اپنے بلند پایہ خطبات پیش کیے۔ رشید احمد صدیقی کا خطبہ "غالب شخصیت اور شاعری" اس سلسلے کے خطبات کا بیت الغزل تھا۔ یہ خطبہ ایم۔ اے۔ کے نصاب میں شامل ہے اور اسی خطبہ پر رشید صاحب کو حکومت نے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا۔
۱۹۷۵ء میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ "اردو شاعری میں قومیت کا تصور" مکمل کیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں کی نگرانی کا کام ابھی تک برقرار ہے۔
دہلی میں حسنِ اتفاق سے لُغت کے کام کی نگرانی کے لیے قبلہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم بھی شعبۂ اُردو دہلی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جب تک وہ دہلی میں رہے میں اُن سے برابر استفادہ کرتا رہا۔ وہ بڑی شفقت سے میری ہر الجھن دور کرتے تھے۔ مولانا واصف دہلوی مرحوم سے بھی اُن کی عمر کے آخری حصہ میں شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ مرحوم بڑے پائے کے عالم اور مستند اہلِ زبان تھے۔ سائل دہلوی کے شاگرد تھے۔ میں نے اُن سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ قیامِ دہلی کے تیس سال میں کبھی کبھی بڑے صبر آزما لمحات بھی گزرے۔ ایسے تاب شکن لمحات میں جن احباب سے تسلی اور تقویت ملی اُن میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر شریف احمد، جی سی گوئل، ڈاکٹر فہیم حیات جاوید اور احمد صدیق صاحبان کے نام سرِ فہرست ہیں۔ میں دہلی کے تمام احباب کا ممنون ہوں اور اُن کی محبت اور رفاقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

عقیل احمد : آپ کی شادی کب اور کہاں ہوئی؟ اس کا مجھے علم ہے کہ آپ کے خدا کے فضل سے دو بیٹے ہیں۔

فریدی : ۱۹۵۴ء میں میرا رشتہ کانپور کے ایک ممتاز اور معزز گھرانے میں خواجہ محمد نعیم صاحب کی چھوٹی بہن مشرف جہاں سے ہوا۔ میری شریکِ حیات نے میری شاعری اور قلندری کی ناز برداری کی۔ میں ان کی رفاقت پر نازاں اور ان کی عالی ظرفی اور تحمل کا ممنون رہا ہوں۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں شاہد سلمہ پیدا ہوئے ان کا تاریخی نام مولانا حامد حسن

قادری نے "شاہد مغیث الدین" رکھا۔ شاہد سلمہٗ کے دماغ کی نشو و نما پورے طور پر نہ ہو سکی اور وہ ذہنی معذوری کے ساتھ پرورش پاتے رہے۔ سن بلوغ کو پہنچے تو دماغی معذوری نے جنون کی شکل اختیار کرلی۔ ہر طرح کے علاج کیے گئے مگر فائدہ نہیں ہوا۔ ان کی بیماری نے مجھے اور میری بیگم کو برابر اعصابی تناؤ اور ذہنی انتشار میں مبتلا رکھا۔ ۱۹۶۱ء میں فیض سلمہٗ پیدا ہوئے۔ ان کا بھی تاریخی نام "محمد فیض الدین فریدی" ۱۳۸۱ ہجری

قادری صاحب نے ہی تجویز کیا تھا۔ فیض سلمہٗ نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی (آنرز) کیمسٹری پاس کرنے کے بعد دہلی سے فارمیسی کا ڈپلوما حاصل کیا اور ۱۹۸۳ء میں فارمسسٹ ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔ میرے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہم لوگوں کے اصرار پر عرب کی ملازمت چھوڑ کر واپس آگئے۔

فیض سلمہٗ کا رشتہ صبا فردوس سے ہوا۔ اُن کے ایما پر ہم سب دہلی سے ہجرت کر کے کانپور آئے اور جاجمؤ میں سکونت اختیار کرلی ہے اب ہمارے چھوٹے سے قافلے میں فیض اور صبا کی بیٹی منیبہ فریدی عرف بیا بھی شامل ہو گئی ہے۔

عقیل : کیا آپ کوئی ایسا واقعہ بتا سکتے ہیں جس نے آپ کو بیحد متاثر کیا ہو؟

فریدی : میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ ایک جانکاہ سانحہ ہے میرے چھوٹے بھائی معین فریدی مرحوم کی کرب ناک علالت اور بے وقت رحلت، میری سخت جانی نے اب تک عزیزوں کی اور احباب کی دائمی جدائی کے کیسے کیسے صدمے جھیلے اور پھر دل پر یہ کہہ کر پتھر رکھ لیا ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

مگر یہ صدمہ روح کو گھلاتا رہتا ہے۔ نرسنگ ہوم کے وہ روح فرسا مناظر تنہائی میں میری نیند اُڑا دیتے ہیں۔ معین فریدی مرحوم کو مجھ سے جو بے پناہ محبّت تھی میں اس کا حق ادا نہیں کر سکا۔ اس نے جیسی مری خدمت کی میں اس کا صلہ نہیں دے سکا۔ معین فریدی مرحوم کی نشانیاں خرم فریدی، خاور فریدی اور عرشی فریدی اپنی زندگی میں کامیاب اور بامراد رہیں۔ آمین۔

عقیل احمد : آپ کی شاعری کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

فریدی : میری شاعری کا آغاز سلام اور منقبت سے ہوا۔ میرے خاندان میں ہر سال ماہِ محرم میں پانچ اور سات کو مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔ ان مجالس میں سلام، مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے تھے۔ اُن مجالس میں پیش خوانی کے طور پر بچپن سے ہی میں میر انیس کی رباعیات پڑھتا تھا۔ میں کس مجلس میں کون سی رباعی

پڑھوں گا اس کا انتخاب میرے والد بیرزادہ عظیم الدین مرحوم کرتے تھے۔ غالباً
بارہ سال کی عمر ہوگی جب میں آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا تو مجھے اچانک یہ خیال
آیا کہ میں دوسروں کا کلام پڑھتا ہوں کیوں نہ اپنا کلام پڑھنے کی کوشش کی جائے۔
چناں چہ کچھ شعر سلام کے کہے اور انھیں لے کر حضرت نظام فتح پوری کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ انھوں نے میری توقع کے خلاف میری ہمت افزائی کی اور میرے
اشعار کو اپنی اصلاح سے اس قابل کر دیا کہ میں بے جھجک مجلس میں پڑھ سکوں۔ البتہ
میرے سلام کے مطلع میں انھوں نے کوئی ترمیم نہیں کی اور یہ فرمایا کہ ان اشعار
سے یہ اندازہ ہوگیا کہ تمھارے اندر شعر کہنے کی صلاحیت ہے۔ امتحان کے بعد شعر
کہنے کی مشق کرو، شاعر ہو جاؤ گے اس انکشاف سے خوشی ہوئی۔ مجلس میں جب
اپنے کہے ہوئے اس مطلع کی بزرگوں سے داد پائی تو ہمت اور بڑھی۔ وہ مطلع آج
تک یاد ہے اس سلام کے باقی اشعار ذہن سے محو ہو گئے۔

خیال روئے شہِ تشنہ کام رہتا ہے
ہمیں تو دل کی عبادت سے کام رہتا ہے

دو سال تک خاموشی سے شعر کہتا رہا۔ اور حضرت نظام فتح پوری سے ان اشعار پر اصلاح لیتا
رہا۔ لیکن مجھے آگرہ کے مشاعروں میں شعر پڑھنے کی اجازت والد صاحب نے ہائی اسکول
کے امتحان کے بعد دی۔ ۱۹۴۰ء میں ہائی اسکول کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد
دربار شاہ ولایت نائی کی منڈی آگرہ میں انجمن بہار ادب کا طرحی مشاعرہ تھا حضرت نظام
فتح پوری مجھے اس مشاعرہ میں اپنے ہمراہ لے کر گئے اس مشاعرہ کی صدارت پروفیسر
محمد طاہر فاروقی مرحوم نے کی تھی۔ اس مشاعرہ میں رعنا اکبرآبادی اور صبا اکبرآبادی کی
شخصیت اور شاعری دونوں نے متاثر کیا۔ اس طرح آگرہ کے ادبی حلقے میں
تعارف ہوا۔

عقیل احمد : فریدی صاحب اردو غزل میں آپ کا منفرد مقام ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ آپ کا
جمالیاتی احساس اور منفرد لب ولہجہ آپ کی شناخت ہے۔ غزل کے سلسلے میں آپ کا
نقطۂ نظر کیا ہے؟ کیا آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں۔

فریدی : میں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم بھی کہی ہے اور طالب علمی کے زمانے
میں شاید نظمیں، غزلوں سے زیادہ ہی کہی ہیں۔ میری نظمیں خیام لاہور، عالمگیر لاہور،
مشہور، دہلی اور خاتون مشرق دہلی میں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۰ء میں نظموں کا مجموعہ
منظر عام پر آنے والا تھا کتابت ہو چکی تھی۔ یکایک یہ خیال آیا کہ ان رومانی نظموں میں
کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ میری شاعرانہ شناخت کا ذریعہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی
اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا۔ کتابت شدہ اوراق کی جلد بندی کرا کے الماری میں
بند کر دیا۔ اس وقت جو غزل کہہ رہا تھا اس کا مقطع شاید اسی فیصلہ کا ترجمان ہے۔

مُنکرِ فنِ غزل تھا جو فریدی اب تک
وہی اِس جنسِ گرامی کا خریدار بھی ہے

اس کے بعد سے غزل ہی کہہ رہا ہوں اور غیر شعوری طور پر غزل سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اظہار غزل کے مقطع میں ہوتا رہا ہے۔

ہے فریدی تقاضائے رنگِ غزل، ذہن کی روشنی روح کی تازگی
شعلۂ احساس کا پَیکر حرف میں ڈھل کے نکھرے کسی شعلہ رو کی طرح

ہزار شیوے تھے گفتگو کے ہزار انداز تھے سخن کے
مگر بہ ایمائے دل فریدی، فدائے رنگِ غزل رہا ہے

۱۹۸۷ء میں غزلوں کا مجموعہ "کفرِ تمنا" چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اور مقدمہ ڈاکٹر شریف احمد نے لکھا۔ میری شعری خدمات پر دہلی اردو اکیڈمی نے ایوارڈ برائے شاعری ۱۹۸۷ء سے نوازا۔

عقیل احمد : میری ذاتی رائے ہے کہ اس وقت ملک میں فنِ تاریخ گوئی میں آپ کا جو مقام ہے وہ شاید کسی دوسرے کو میسّر نہیں ہے۔ ہم آپ کی زبان سے ایک دو تاریخیں سنناچاہتے ہیں اس کے ساتھ اس کا پس منظر بھی بتادیں تو عنایت ہوگی۔

فریدی : تاریخ گوئی کے فن سے مجھے دلچسپی تو تھی لیکن دہلی آنے سے پہلے میں نے کوئی تاریخ نہیں کہی تھی۔ دہلی میں ایک دوست کی شادی پر ایک بے تکلف تاریخ کہی تھی۔ جس میں حافظ شیرازی کا یہ مصرع تضمین کیا گیا تھا ؏

خیز و در کاسۂ زر آبِ طرب ناک انداز
۱۳۶۸

اس مصرع کے اعداد ۱۳۶۸ امیں مطلوبہ سن ۱۳۸۹ تھا اُسے حاصل کرنے کے لیے "اُف" کے ۸۱ اعداد کا تخرجہ کیا گیا تھا۔ یہ تاریخ احباب کو پسند آئی۔ تاریخ سے زیادہ تخرجہ کی داد ملی۔ اُس زمانے میں جوش ملیح آبادی مرحوم دہلی آئے ہوئے تھے۔ نثار احمد فاروقی صاحب نے میری تاریخ جوش صاحب کو سنائی اور مجھ سے آکر کہا کہ جوش صاحب کو تمھاری تاریخ بہت پسند آئی۔ اگلے دن شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں جوش صاحب کے اعزاز میں جلسہ تھا میں نے اس جلسہ میں جوش صاحب کے خیر مقدم کے طور پر ایک قطعۂ تاریخ پیش کیا یہ میری طرف سے جوش صاحب کی داد کا شکریہ بھی تھا۔ یہ تاریخ جوش صاحب کے ایک مشہور مصرع سے برآمد ہوئی تھی۔

یہ کون آیا کہ بزمِ شعر و نغمہ جگمگا اُٹھی
صدائے قلقلِ مینا ہیں کس کا نام ہے ساقی

دل و دیدہ ہوئے جاتے ہیں فرش راہ سے خانہ
جھکی مینا کی گردن خم ادب سے جام ہے ساقی
پئے تاریخ مصرع جوش کا پڑھ کر "صبا" نکلی
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

۱۹۶۷ = ۲۰۶۰ - ۹۳

ان دونوں قطعوں سے تاریخ گوئی کی شہرت ہوگئی اور تاریخ کہنے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔

عقیل : آج کل آپ کے مشاغل کیا ہیں؟

فریدی : درس و تدریس کے بعد میرا مشغلہ شعر گوئی اور تاریخ گوئی تھا مگر اب بقول حالی ؎

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

حرفِ اوّل

غزل داخلی کیفیات اور تمدنی احوال کا نتیجہ ہے اس لیے اس کا انداز و اسلوب ہر زمانے میں بدلتا رہے گا اور چوں کہ شاعر کے ذہنی نقش و نگار کو مختلف عوامل مل کر ترتیب دیتے ہیں اور شعری صداقت خارجی صداقت سے مختلف ہوتی ہے اس لیے ایک شاعر کا انداز بھی دوسرے سے مختلف ہوگا۔ یوں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر وہی شاہد و شراب اور شمع و پروانہ کی داستان سُنا رہے ہیں جو ولی اور سراج کے زمانے سے بیان ہو رہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان رموز و علامات کی توجیہہ اور تفسیر زندگی کے ساتھ بہت کچھ بدلتی رہی ہے اور الفاظ کے پیچھے احساس و تاثر کی جو دنیا ہے وہ اپنی علیحدہ اور امتیازی شان رکھتی ہے۔ جتنی اچھی غزل ہوگی اس میں رمز و ایما کی طلسمی کیفیات کا اتنا ہی بڑا کمال ہوگا اور علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی معنی آفرینیاں بھی بڑھ جائیں گی۔ اچھی غزل میں ان کہی باتوں کی طرف چشمِ سخن سے اشارے کیے جاتے ہیں اور اس کا ہر نقش فریادی ہوتا ہے۔ غزل کا اختصار و ایجاز اور اس کی ریزہ کاری بھی اس کا عیب نہیں بلکہ حسن ہے اور موجودہ رنگا رنگ اور رَواں دَواں زندگی کے مطابق ہے۔ سائنس داں اور شاعر دونوں حق کی تلاش کرتے ہیں۔ دونوں کے راستے الگ ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے بلکہ ایک اعتبار سے شعر کو سائنس پر برتری حاصل ہے۔ سائنس اقدار کی محرم نہیں اور شعر کا سارا حُسن اقدار ہی پر منحصر ہے۔ اُردو کے غزل گو شاعر مسئلہ کے اس پہلو سے بے خبر نہیں تھے، اُن کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ انھوں نے اس مقام تک دل کے راستے سے پہنچنے کی کوشش کی اور احساسِ جمال کو بطور قدر استعمال کر کے معاشرہ کے تزکیہ اور تہذیب میں وہ نمایاں حصہ لیا جو دوسرے اکابر کی دسترس سے باہر تھا۔

اُردو غزل کی یہ کہکشاں فانیؔ، فیضؔ، فراقؔ اور میکشؔ اکبر آبادی پر ختم نہیں ہوتی۔ اس میں نئے ستاروں کے اضافے کا سلسلہ جاری ہے ان روشن اور تابناک ستاروں میں مغیث الدین فریدی بھی شامل ہیں جن کی غزلوں میں وہ کلاسکی رچاؤ ہے جو اُن کو پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم اور حضرت میکش اکبر آبادی کی ادبی صحبتوں سے ملا ہے۔ وہ حُسنِ تناسب اور خوش آہنگی ہے جو ارضِ "تاج" کی دین ہے۔ وہ ادب وہ شایستگی وہ دھیما دھیما سوز ہے جو حضرت سلیم چشتی رح کی

بارگاہ کا فیضان ہے وہ تازگی، شگفتگی اور جدّت طرازی ہے جو علی گڑھ کی تعلیم اور اس کے علمی ماحول کا نتیجہ ہے۔ فریدی صاحب بڑے مؤدّب، شائستہ اور دردمند انسان ہیں۔ ان کا طرز و اسلوب آراستہ اور بے عیب ہے۔ وہ زندگی اور فن کے جدید تقاضوں سے باخبر ہیں۔ ان کے غم کی دھیمی اور پُرسوز لے نے اُن کے اشعار کو نوائے سرمدی یا غالب کا تبریم کش بنا دیا ہے۔ وہ کم کہتے ہیں مگر محنت سے کہتے ہیں۔ غزل میں حُسن بغیر ریاضت کے ممکن بھی نہیں ہے۔ غزل کا جادو جگانے کے لیے صاحبِ ساز کا لہو رگِ ساز میں شامل ہو جاتا ہے۔ فریدی صاحب کی غزل کو اُن کے دِل کے لہو نے سنوارا ہے اور لفظ و محاورہ کی نبض شناسی نے اُن کے فن کے حُسن کو نکھارا ہے۔ اُن کے اشعار میں درد کی وہ لَو ہے جو لازمۂ انسانیت ہے اور جس کو ارسطو نے زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ان سب خصوصیات نے مل کر اُن کے مجموعۂ کلام کو ایک آہوئے رمیدہ بنا دیا ہے جو صحرائے جاں سے گزر رہا ہو اور ہم اُسے حیرت و حسرت سے دیکھتے رہیں۔

غزالے بہ صحرائے جاں می گزشت
کمندے ز تارِ نظر ساختیم

پروفیسر قمر رئیس

فریدی کی شعری حسیّات

فریدی صاحب کم و بیش تیس سال سے ہمارے رفیق کار ہیں اور ہم ان کی شفاف لیکن پہلو دار شخصیت کی کئی جہتوں سے بخوبی آشنا ہیں وہ غیر معمولی حساس طبیعت کے آدمی ہیں اور اپنے بعض ذاتی مسائل کی بنا پر ایک طویل عرصے سے اعصابی تناؤ میں بھی مبتلا ہیں جس نے ان کی شاعری پر خاص اثرات مرتب کیے ہیں۔ ایک دوسرا پہلو ان کا قلندرانہ مزاج ہے جس میں شاید ایک بڑی خانقاہ سے ان کی وابستگی کا اثر بھی رہا ہے۔ درویشی اور قلندری کا یہ انداز شاید ہمارے دوسرے اساتذہ کے یہاں نہیں ملتا، اس نے انھیں دنیاوی جاہ و منزلت شہرت اور دولت کی ہوس سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ فریدی صاحب کی شخصیت کا ایک اور انداز ان کی وسیع المشربی اور آفاق گیر محبت کی شکل میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ ان کی شخصیت اور سخن وری کا ایک اور پہلو کلاسیکی شاعری اور اس کی روایات سے ان کی گہری وابستگی ہے۔ آگرہ میں میکش اکبرآبادی کی ذات سے ان کو گہری وابستگی رہی ہے جو کلاسیکی شاعری کی برگزیدہ روایت اور تصوف کے مسلک سے وابستہ تھے۔ فریدی صاحب کی شاعری میں بھی کلاسیکی نظم و ضبط کی فراوانی ہے۔ ابھی ایک دوست نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج کے شاعر جس جدید فکر اور خیال کو کلاسیکی آداب اور لہجہ میں ادا کرتے ہیں۔ وہ جدید فکر و خیال فریدی صاحب کے ہاں بہت کم ملا ہے۔ چند اشعار ایسے آپ نکال سکتے ہیں جن میں آج کے سماجی حوالوں سے آج کے سماج میں آشوب ابتلا کی ایک طرح کی کیفیت ہے۔ اس کا کہیں کہیں شعر کی عملی زبان میں اظہار ہوا ہے۔ ورنہ ان کے تجربات کی نوعیت دوسری ہے۔ بنیادی طور پر فریدی صاحب ایک اخلاقی انسان ہیں اور آج کے شاعروں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی زیادہ وثوق کے ساتھ اور انسان دوستی اور ایک آفاق گیر محبت کا جذبہ ان کی شاعری میں بھی اور ان کی شخصیت میں بھی ایک طرح کے توازن کے ساتھ ملتا ہے اور یہ سبق ہم نے ہمیشہ ان کی قربت میں رہ کر سیکھا ہے ؎

رقصِ شررِ جاں، دلِ گیتی کی ہے دھڑکن
میں اپنی بھی آواز ہوں سب کی بھی صدا ہوں

جب ظہیر صاحب نے یہ شعر پڑھا اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ شعر ان کے اس مسلک کی طرف

بھرپور اشارہ کرتا ہے۔ ابھی ان کی طبیعت کا میں نے بتایا کہ ایک تو Temprament اور دوسرے ان کے Tensions اور Ideals اور تیسرے ایک خاص طرح کی خودنگاہی جو ان کے ہاں ملتی ہے یہ سب ان کے تجربات اور مشاہدات کی ترکیب سے عمل میں آتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک خاص طرح کی محرومی کا احساس ہے۔ حسرت اور مایوسی، اندرونی کرب اور بے چینی کا اظہار ہے جو مسلسل ایک لہر کی طرح ان کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے اب اس کو لوگوں نے میرؔ سے متاثر ہونے کا انداز کہا ہے۔ لیکن میں اس کے لیے معافی چاہوں گا کہ میرؔ کا اثر ان کے لب و لہجہ میں نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو تھوڑا سا فانیؔ کا ہے ورنہ اقبالؔ اور غالبؔ کا لہجہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے۔ میرؔ کا لہجہ شاید میرا خیال ہے کہ ان کے ہاں نہیں ہے تو یہ باطنی کرب اور تشنگی کا ایک عجیب و غریب گہرا اور تیکھا احساس ان کے ہاں ملتا ہے جیسے ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہو اور اس میں ایک یہ بھی احساس ہے کہ زندگی سے اپنی درویشانہ طبیعت کی بنا پر فریدی صاحب نے بہت کم مطالبے کیے ہیں۔ ایسا لگتا ہے اور اس کے باوجود جو مطالبے کئے گئے تھے وہ بھی پورے نہیں ہوئے یا کم سے کم پورے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ کرب بے چینی یہ ایک طرح کی محرومی یا حسرت کا احساس ان کی شاعری میں ہمیں شروع سے آخر تک نظر آتا ہے اور اس میں تنہائی کا احساس بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ؎

ختم ہے جشنِ فصلِ بہاراں ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے

اس ردیف میں جو غزل ہے۔ ان کی وہ اس سلسلے کی بڑی موثر غزل ہے ؎

مٹا جاتا ہے دل سے عکس ماضی — یہ بستی ہے شکستہ مقبروں کی
سفر کی آخری منزل ہے اور ہم تنہا — بچھڑ کے رہ گیا اک ایک ہم سفر تنہا

لیکن اسی کے ساتھ فریدی صاحب نے بہت اعلا درجہ کی شاعری بھی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سفر میں یعنی اپنی محزونی، تنہائی اور اذیت کوشی کے اس عمل میں فریدی صاحب کی شاعری نے کہیں کہیں وہ منزلیں بھی چھو لی ہیں۔ جہاں بہت کم شاعر اس شان سے پہنچ پاتے ہیں۔ اس عارفانہ سطح پر یا شعور تک پہنچ کر شعر کہہ پاتے ہیں۔ شعر بظاہر بہت سادہ نظر آتے ہیں لیکن آپ اگر ان پر غور کریں اور ان کے تاثر کی تہ داریوں اور کیفیتوں پر غور کریں تو وہ جو بے نیازی کا عمل ان کے ہاں ایک خاص بلندی پر ملتا ہے اور اس میں طلسمات زندگی کا مشاہدہ شاعر ایک خاص بلندی سے کرتا ہے۔ وہ شعر بھی ان کے ہاں ہمیں بہت مل جاتے ہیں۔ جس کی طرف ایک دفعہ رشید حسن خاں نے بھی اشارہ کیا ہے ؎

اب کسی درد کا شکوہ نہ کسی غم کا گلہ
میری ہستی نے بڑی دیر میں پایا ہے مجھے

یا

بار تھی روح پہ کل اپنے ہی دل کی دھڑکن
اب یہ کیا ہے کہ طبیعت پہ گراں کچھ بھی نہیں

یہ اشعار بڑی شاعری کے ذیل میں آتے ہیں۔ کس بلندی پہ شاعر نے شعر کہا ہے اور کس عجیب و غریب اور پُر اسرار کیفیت کو فریدی صاحب نے پیش کیا ہے۔ اسی طرح شریف صاحب نے ایک جگہ اشارہ کیا کہ کچھ خاص طرح کے پہلو دار تجربے ہیں جیسے "آئینہ" اسی طرح کچھ خاص الفاظ ہیں جو ایک کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ جو فریدی صاحب کی اندرونی شخصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ جس کا ثبوت مجموعہ کے نام "کفر تمنا" میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح کے حسرت و تشنگی کے شدید تر احساسات کی ترجمانی کرنے والے الفاظ جن کی طرف ابھی میں نے اشارہ کیا ہے وہ دہرانا نہیں چاہتا ہوں۔ تمنا، آرزو اور اس قبیل کے دوسرے الفاظ جو مختلف پہلوؤں سے ان کی غزل کے حاوی رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

جلتے ہوئے غم کے کنول، بجھتی ہوئی شمعِ وفا
شہرِ تمنا آج کل آباد بھی سونا بھی ہے

کسی غزال میں بھی اب نہیں رم وحشت
ہم اپنے سحرِ تمنا سے کس کو رام کریں

پھر سرِ شاخِ آرزو کھل کے مہک اُٹھی کلی
درد کی فصل ہو چکی، داغ کے دن گزر گئے

میرے دیدہ و دل کا عالم نہ پوچھو
کوئی آرزو جیسے محوِ دعا ہے

راہ پُر پیچ یہ ہے زلفِ رسا کا دھوکہ
دشتِ آغوشِ تمنا نظر آیا ہے مجھے

اس طرح کے اور بھی اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ فریدی صاحب کا مجموعہ بہت مختصر ہے۔ اس میں اس طرح کے شعری پیکروں کے حوالے سے ان کی شاعری کے کردار کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس طرح اس زاویے سے بھی شاعر کے شعری ضمیر کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ یہی کیفیت اپنے ذاتی دکھ درد کو لے کر ان کو اوپر اُٹھاتی ہے۔ وہ ان کی انسان دوستی کے ایک خاص محور کی طرف رہنمائی کرتی ہے ؎

آرائشِ گیتی کا تو کیا ذکر ہے اے دل
حق یہ ہے خدا کو بھی خدا ہم نے بنایا

گزر جاتے ہیں بزم دہر سے دامن کشاں لیکن
اُلٹ دیتے ہیں اکثر پردۂ افلاک دیوانے

دیوانے کی ردیف میں جو غزل ہے اس میں اس طرح کے اکثر شعر ہیں۔ اسی طرح تنقیدِ حیات کا حوالہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے ؎

جہاں اُگتی ہیں فصلیں خنجروں کی	وہیں بارش بھی ہوتی ہے سروں کی

یا

رفتہ رفتہ یہ قفس بھی آشیاں ہو جائے گا	اور کچھ دن تم قفس کو آشیاں کہتے رہو

حقیقت یہ ہے کہ فریدی صاحب کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کا ایک جملہ مجھے یاد آتا ہے جو میں پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ فریدی صاحب کی شاعری سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے کلاسیکی شاعری کے مذاق میں رچا بسا ہونا ضروری ہے اس کی طرف دوسرے احباب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں آپ سب کے سامنے کہ میری جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ میں اس مجموعہ پر قلم اُٹھاؤں اور کچھ لکھوں۔ کیوں کہ اس کے ایک ایک مصرع پر فریدی صاحب نے اتنی محنت کی ہے کہ ایک ایک لفظ کے معنوی پہلوؤں کی تلاش و تفحص میں اور اس کے استعمال میں اور اس کے جڑنے میں جو سلیقہ انھوں نے دکھایا ہے وہ کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔

نوٹ: ڈاکٹر مغیث الدین فریدی کے شعری مجموعے کے اجرا کے سلسلے میں شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں ہونے والے ایک جلسے میں کی گئی گفتگو کا اقتباس۔

ڈاکٹر شریف احمد

کفرِ تمنّا یا اعترافِ ایمان؟

فریدی صاحب کی عمر اکسٹھ سال ہے۔ ان کی شاعری ہوش مند اور پختہ شاعری کی عمر، کسی طرح بھی اکتالیس سال سے کم نہ ہوگی ـــــ کم و بیش پچیس سال تو انھیں صرف دہلی یونیورسٹی میں درس دیتے بیت رہے ہیں۔ پہلی ملاقات میں بھی انھیں ایک شاعر پایا۔ آج بھی وہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ غالباً، فریدی صاحب کا سب سے سچّا اور سیدھا تعارف ہے ـــــ لیکن شاعر اور شاعر میں فرق ہوتا ہے۔ فریدی صاحب شاعر ہیں ـــــ فرق کے ساتھ! اور اس فرق نے ہی انھیں منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ اُن کی زندگی اور شخصیت میں، شخصیت اور شاعری میں کوئی بُعد نہیں۔ آپ "کُفرِ تمنّا" پڑھ لیجئے، فریدی صاحب سے آپ کی "ملاقات" ہوگئی۔ آپ فریدی صاحب سے مل لیجئے، آپ کہیں گے: ـــــ "کفرِ تمنّا" کا خالق یہی شخص ہو سکتا ہے۔

کچھ ایسا ہوا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں فتح پور سیکری والے شیخ سلیم چشتی کے خانوادے میں ایک ذہین، بیدار مغز اور حسّاس طبیعت رکھنے والا لڑکا پیدا ہوا ـــــ نام رکھا گیا مغیث الدین۔ اچھی تربیت، ستھری تعلیم، خاندانی ماحول اور آگے چل کر شفیق اور علم دوست استادوں نے، جواں سال طالب علم کی دیکھی اور ان دیکھی صلاحیتوں کو بیدار کیا، جن میں سب سے نمایاں صلاحیت شعر گوئی تھی۔ اور یوں مغیث الدین، فریدی ہو گئے۔

ابتدائی چند سال، فتح پور سیکری میں گزارنے کے بعد، ان کی زندگی کے وہ ماہ و سال جن میں شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے، آگرے میں گزرے۔ انٹرنس اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات یہیں سے پاس کر کے انھوں نے آگرے کے سینٹ جونس کالج میں داخلہ لیا۔ یہ کالج آگرے کا ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کا مشہور ترین کالج ہے اور یہیں اُردو کے نامور ادبی مورّخ اور نقّاد، حامد حسن قادری (مرحوم) سے انھیں تلمّذ کا شرف حاصل ہوا۔ اُن کی شعر گوئی اور بالخصوص تاریخ گوئی پر قادری مرحوم کا بڑا گہرا اثر رہا ہے ـــــ ایم۔ اے کے دو سال فریدی نے علی گڑھ میں گزارے۔ اُس وقت کا علی گڑھ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، مسعود حسین خاں، خورشید الاسلام اور جذبی جیسے اساتذہ اور فن کاروں کا علی گڑھ تھا۔ فریدی نے حسبِ توفیق، ان سے سیکھا ـــــ اور چند سال بعد ہی انھیں اپنی مادرِ علمی، سینٹ جونس کالج میں استاد کی جگہ مل گئی اور یہاں انہوں نے اپنی زندگی کے

بہترین سترہ سال گزارے ـــــــ ۱۹۶۲ء میں وہ دہلی یونی ورسٹی سے منسلک ہو گئے اور یہ انسلاک ۱۹۹۱ء تک باقی رہا۔

فریدی کی شخصیت میں تصوّف، حامد حسن قادری، رشید احمد صدیقی اور اُن کے حوالے سے علی گڑھ کے اثرات یکجا ہو گئے ہیں ـــــ بے نیازی، صُلحِ کُل، انکسار اور اس کے ساتھ ہی انفعال تصوّف کا پیدا کردہ ہے۔ اچھے شعر کا ذوق اور اس پر صنّاعانہ گرفت حامد حسن قادری کی یاد دلاتی ہے ـــــ رشید احمد صدیقی سے ربط کا یہ عالم ہے کہ اُن کے نثری اقتباس کے اقتباس وہ زبانی سُنا سکتے ہیں اور علی گڑھ کی چھاپ تو اُن کی گفتگو اور علم و عمل اور ردِّ عمل تک میں نظر آتی ہے۔

اُن کی بے نیازی کی ایک دلیل خود زیرِ نظر شعری مجموعہ بھی ہے ـــــ ایسے پُرگو شاعر کا اتنا مختصر کلام ۔ ؟! انہوں نے بہت کہا ہے، بہت لکھا ہے۔ کہا اور بُھلا دیا، لکھا اور گنوا دیا ـــــ اس مجموعے کی تالیف بھی اُن کے ایک لائق شاگرد اور ذاکر حسین کالج کے اُستاد محمد فیروز دہلوی کی پیہم ضد اور کوشش کا نتیجہ ہے ـــــ

لیکن شعر گوئی کے لئے بھی تو کوئی بنیاد چاہیئے ـــــ فریدی کی شاعری کو یہ بنیاد ملی خاندانی، تہذیبی اور سماجی اقدار سے - مطالعے کی وسعت نے روایت کی شناخت، احترام اور رچاؤ پیدا کیا ـــ لیکن تیزی سے بدلتا ہوا زمانہ، ان اقدار سے اُلجھ گیا - زندگی نے انھیں بہت اچھے دن بھی دکھائے اور بہت بُرے بھی ـــ فریدی کی شاعری، اُسی اُلجھاؤ اور اُلجھن، تنا تنی اور کشمکش سے پیدا ہوتی ہے ـــــ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نئی بات اور اس سے بھی زیادہ کام کی بات یہ ہے کہ میں اور آپ یہ دیکھیں کہ اس گھمسان کے رَن میں شاعر کا کیا رویّہ ہے؟ وہ کہاں اور کیسے کھڑا ہوا ہے؟ اس کی آواز چیخ بنتی ہے، یا نغمہ؟ اگر نغمہ ہے تو ہمارے کانوں کو کیسا معلوم ہوتا ہے، معمولی یا غیر معمولی؟ اور پھر یہ نغمہ ہمارے نغموں کے خزانے میں کوئی اضافہ کرتا ہے۔؟

اور یہ نغمہ سرائی فریدی نے غزل کے فارم میں کی ہے ـــــ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے صرف غزل کہی ہو۔ غزل کے علاوہ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، قطعات بھی اور تضمینیں بھی - اُن کی کئی نظمیں اور اُس سے بھی زیادہ تضمینیں اہلِ نظر نے پسند کی ہیں۔ قطعات اور بالخصوص تاریخی قطعات میں تو وہ اپنا مثیل نہیں رکھتے۔ لیکن زیرِ نظر صفحات تو صرف اُن کی غزلیات کا انتخاب اور چند تضمینیں ہیں لیکن ان کا شعری مزاج اصل میں غزل گو ہی کا مزاج ہے۔

اس سے پہلے کسی جگہ ان کی وسیع المطالعی کی بات کی گئی ہے۔ اس بات کو یہاں پھر ذہن میں رکھ کر، ان کی غزلیات کا مطالعہ کیجیے ـــــ پہلا وصف جو اُن کی غزلیات کا اُبھر کر آتا ہے وہ روایت کا رچاؤ ہے ۔ فارسی اور اردو کی بڑی غزلیہ شاعری کا انہوں نے بھر پور مطالعہ کیا ہے۔ یوں بھی وہ حافظ نظیری، عرفی، میر، غالب اور اقبال پر بصیرت افروز بات چیت کرتے ہیں - اپنے عہد کے شاعروں میں وہ فراق و فیض کے جادو کے قایل ہیں۔ فیض کی اہم نظموں کو بھی وہ فیض کے تغزل کا ہی فیضان سمجھتے ہیں ـــــ غزل کی روایت کو انھوں نے فن کے پورے لوازمات کے ساتھ قبول کیا

ہے ـــــ یہاں ایک اور بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے ـــــ فریدی، عروض کے بہت بڑے پارکھ ہیں اور اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ عروض کا پارکھ صرف پارکھ ہو کر ہی رہ جاتا ہے یعنی وہ جب خود شعر کہتا ہے تو اس کی نظر صرف فن کے خارجی پہلو تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور شعریت کسی اور "محفوظ" مقام پر چلی جاتی ہے ـــــ خوشی کی بات ہے کہ فریدی اپنی غزلوں میں کہیں بھی عروض کے ایسے پارکھ نہیں معلوم ہوتے ـــــ عروض کو وہ محض ایک وسیلہ، معتبر وسیلہ سمجھتے ہیں، جس کے ذریعے لفظ اور معنی کے اس آمیزے کو پیش کیا جاتا ہے جسے تجربہ کہتے ہیں ـــــ اور یہ تجربے کا خلوص اور سچائی ہی ہے جو اُن کے اکثر اشعار میں ملتا ہے۔

غزلیات فریدی کا ایک خوش آیند پہلو یہ بھی ہے کہ روایت کا تصوّر ان کے یہاں ٹھہرا ہوا یا جامد نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اس کا محرّک خود تبدیلی کی علامت ہے۔ یعنی آج کے شعر میں اور میرؔ و غالبؔ کے عہد کے شعر میں کوئی فرق ہونا چاہیے، یہ طرز احساس کا ہو یا خیال کا ـــــ ہاں اگر آج کی غزل، میر و غالب پڑھ کر یہ کہیں کہ یہ غزل سرے سے ہے ہی نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزل کی روایت مکمل بدل گئی ـــــ اور ایسی غزل کو ضروری نہیں کہ غزل ہی کہا جائے۔ کچھ بھی نام دیا جا سکتا ہے۔

فریدی کی غزلیں پڑھیے تو ڈکشن اکثر و بیشتر وہی ملتا ہے جس سے ہم خاصے مانوس ہیں! جانے پہچانے استعارے، متعارف تشبیہیں، رمز و کنایہ پیدا کرنے والے آشنا الفاظ ـــــ لیکن ان کے ذریعے آج کی زندگی کے معاملات و مسائل کی طرف اشارہ ـــــ اور یہیں فریدی روایت کا پرانا پن دور کر کے اس میں تازگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے کہ ان میں الفاظ، علامت بن گئے ہیں جنھیں نیا تو نہیں کہا جا سکتا لیکن شاعر نے ان میں ایک تازگی ضرور پیدا کر دی ہے:

ہم ہی مارے گئے، ہم ہی رسوا ہوئے، تیرے دامن پہ کوئی بھی دھبّا نہیں
جم گئی ہے مگر دامنِ وقت پر، یہ وفا دشمنی بھی لہو کی طرح

تیز ہیں خنجر ابھی، بازوے قاتل شل نہیں
قتل گاہوں کو مگر دار الاماں کہتے رہو

رات محفل میں وہ تھا، دیدہ و دل کا عالم
جیسے چلتی ہوئی تلوار سے تلوار ملے

بیگانگیٔ خلق سے بیزار نہیں ہوں
یہ اَبر مرے شوق کے صحرا کے لیے ہے

غزل کو ضدی صنفِ سخن کہا گیا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ اس کے سانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی کیجیے تو پھر یہ "غزل" نہیں رہتی۔ اس کی لفظیات میں ردّ و بدل کیجیے، اس طرح کہ نئی زبان کا احساس ہونے لگے، تب بھی یہ "غزل" نہیں رہتی۔ پھر نئی اور پرانی غزل میں یہ کیسے امتیاز ہو؟ علامت کا ماہرانہ استعمال، جس کا ذکر ہوا، امتیاز پیدا کرنے کا ایک حربہ ہے۔ دوسرا طرزِ احساس اور ذہنی رویّہ ہے، جو غزل کی دنیا میں نئے اور پرانے کے درمیان خطِ فاصل ہو سکتا ہے ـــــ فریدی کی غزلیں اس طرح کے جدید احساس اور ذہنی رویّے سے خالی نہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اس دور میں انسان کا چہرہ نہیں ملتا
کب سے میں نقابوں کی تہیں کھول رہا ہوں

بکھرے ہوئے انسان سے کیا پوچھ رہے ہو
میزانِ جنوں، عقل کا معیار کہاں ہے

جہاں اُگتی ہیں فصلیں خنجروں کی   وہیں بارش بھی ہوتی ہے سروں کی
ہم اپنا سر کہاں جا کر چھپائیں   چھتیں ٹوٹی ہوئی ہیں سب گھروں کی

پھر تغزل، جو غزل کی جان ہے اور جو ایسی مخصوص کیفیت ہے، جسے لفظوں میں شاید بند نہیں کیا جا سکتا، فریدی کی ہر غزل میں پایا جاتا ہے:

جاتی ہی نہیں دِل سے تری یاد کی خوشبو
میں دورِ خزاں میں بھی مہکتا ہی رہا ہوں

میں تیرے ہاتھ سے جس کو چھڑا کے لایا تھا
مہک رہا ہے ابھی تک وہ گوشۂ دامن

ہر فطری اور سچّے شاعر کی شاعری میں کچھ الفاظ نادانستہ اور غیر شعوری طور پر بار بار استعمال ہوتے ہیں جنہیں کلیدی الفاظ کہا جا سکتا ہے۔ شاعر کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں ایسے الفاظ بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ کلامِ فریدی بھی اپنی کلیدیں رکھتا ہے ـــــ مثلاً لفظِ آئینہ۔ جو بڑا مستعمل لفظ ہے۔ کم سواد شاعر کے ہاتھوں یہ لفظ خاصا فرسودہ اور پامال ہو سکتا ہے ـــــ فریدی اس سے بار بار کام لیتے ہیں ـــــ بھرپور، اثر آفریں اور نت نیا:

دیر تک ساتھ نہ دے گا یہ جہانِ گزراں
محفلِ دہر کو تم آئینہ بن کر دیکھو

جبیں پر شکن ہے، نہ دامن پہ دھبا، خرد کا ہر اک وار ہنس کر سہا ہے
جہاں سے ملا ہم کو سنگِ ملامت، وہیں ہم نے اک آئینہ رکھ دیا ہے

چاکِ قبا کا آئینہ دیکھ کے دنگ رہ گئے
سنگ اُٹھا کے چل دیے دشت سے ہوش مند لوگ

فریدی بڑے قناعت پسند واقع ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے اب تک قلندرانہ زیست کی ہے۔ شہرت اور دولت کے ہنگاموں سے دور رہ کر، اُنھوں نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ انھیں قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی گزارنے میں وہ مر مر گئے ہیں ـــــ ہو سکتا تھا (اور سارے امکانات تھے) کہ وہ زندگی اور آدم، دونوں سے بیزار ہو جاتے۔ شعر تب بھی کہتے۔ فانی بن نہیں سکتے تھے۔ اور فانی سے کم پر وہ راضی نہ ہوتے ـــــ لیکن حالات و حوادث کی منطق اُنھیں فریدی ہی بنا سکتی تھی، جو وہ بن کر رہے۔

چلتے چلتے یاد کیجیے کہ شاعر اپنے مجموعے کو ''کفِ تمنا'' کا عنوان دیتا ہے ـــــ کیوں ـــــ؟ گزشتہ سطور میں، جہاں شاعری کی زندگی اور زمانے کی بات کی گئی ہے، وہیں اس کا جواب چھپا ہوا ہے ـــــ ہم اسے آسانی سے ''اعترافِ ایمان'' بھی کہہ سکتے ہیں، یہ تو سوچ کا پھیر ہے اور بس۔

⁂

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

سر دلبراں اور حدیث دیگراں کا شاعر

فریدی صاحب کے شعری مجموعہ 'کفر تمنا' کے صفحات پر ایک نظر ڈالتے پر ہی اس کا احساس ہو جاتا ہے اور کیسے کہوں کہ یہ احساس پہلے نہیں تھا کہ غزل کے اشعار کی تحسین و تنقید آسان نہیں شاید اسی لیے فراق نے غزل کو نہایتوں یا انتہاؤں کا سلسلہ کہا ہے۔ دروں بینی، احساسات کی مصوری اور گہرے جذبات کی عکاسی کہنے سے بھی کام نہیں چلتا کہ ان لفظوں کے ذریعے بھی ان فکری رویوں اور تلاش و تفحص کے ان مرحلوں کی نشاندہی نہیں ہوتی جس سے مصرعوں کی تشکیل اور شعریت کی تخلیق کے لیے شاعر کو گزرنا پڑتا ہے۔

مصور اپنے رنگوں اور بت تراش اپنے نقوش و آثار کو بدل نہیں سکتا اس کے ذہن میں ایک نقشِ تصویر اپنے جزو کل کے ساتھ آتا ہے۔ لیکن شاعر کی زبانِ قلم پر آئے ہوئے الفاظ اس کے فکر کی رسائی اور تخلیقی حسیت کی بوقلمونی کے ساتھ برابر بدلتے رہتے ہیں اور جب شعر ایک مرتبہ مکمل ہو جاتا ہے تو وہ سب مرحلے ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں سے اوجھل اور اس کے حافظہ سے محو ہو جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور ایک لفظ یا معنی آفریں لفظی ترکیب پورے شعر کی تقدیر بدل دیتی ہے۔

کسی دوسرے فن پارہ میں سیاق و سباق کے رشتے قریب قریب معین ہوتے ہیں۔ اس سے اثر و تاثر کی جہتیں اور ذہنی سطح پر بنتے ہوئے دھنک کے سے دائرے اپنے حلقے سے باہر اپنی کوئی جہت نہیں رکھتے۔ لیکن ایک اچھے شعر کی معنیاتی سطح اور معنوی زاویوں کا تعین ممکن نہیں۔

سر دلبراں و حدیث دیگراں کی بات کہہ دی جائے یا بادہ و ساغر کہے بغیر کام نہ بنے تو بھی بات نہیں بنتی، جسم کے رنگ ہوں یا کسی پیکر کے خدوخال یہ مانا کہ صبح و شام کے رسمی دھندلکوں اور گزرتے ہوئے لمحوں کی دھوپ چھاؤں تو اپنا تاثر بدل دیتے ہیں۔ لیکن ایک اچھا شعر بالخصوص غزل کا ایک پر معنی و فکر انگیز شعر تو خود ایک فانوس خیال کی طرح ہے۔ جس کی پرچھائیوں کی پیدا کردہ بھول بھلیاں ہر لمحہ ہمیں ایک نئے تجسس، نئے تفکر اور اس سے بڑھ کر نئے

تاثر سے آشنا کرتی ہیں۔

سازو آواز اور رقص و نغمہ سے تو شعر کا جو بھی تعلق ہے لہجہ سے اس کا رشتہ اور بھی زیادہ اور پُر اسرار ہے اس لیے کہ اسی سے شعر کے پس منظر میں موجود اور اس کی تخلیقی حسیت میں شریک تہذیبی شعور اور فنی اساس کا پتا چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر کیوں کہتا ہے اور کس کے لیے کہتا ہے۔ جو احساس، اس کے حال و خیال کو ہم آہنگ کر کے اس سے شعر کہلواتا ہے۔ وہ خود کو لفظ و معنی کے کس پیکر میں ڈھال کر مسرت سے بصیرت تک کے مراحل فکر کو طے کرنا چاہتا ہے۔

فریدی صاحب کی غزل پڑھیے تو فوراً ہی ذہن ان کی زبان اور اس سے زیادہ ان کے لہجہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس توجہ کے ساتھ جو تاثر جنم لیتا ہے۔ وہ شدہ شدہ ہمیں شاعر کی زندگی اور ذہن سے قریب لے آتا ہے۔ فریدی صاحب کے اشعار پڑھتے وقت ان کا لہجہ ان کی طبیعت کی مسکینیت و معصومیت اور رگوں میں دوڑتے پھرنے والے خون کی طرح ان کا زندہ احساس شرافت اور اس کی پیدا کردہ ان کی سلامت روی و خوش فکری ہمیں اپنے حلقۂ تسخیر میں لے لیتی ہے۔ حلقۂ تسخیر سے میری مراد شاعر کے ذہن، زبان اور زندگی کے ساتھ ایک طرح کا Involvement ہے۔ جس کے بغیر کسی فن پارے کی جانچ پرکھ اس سطح پر شاید ممکن نہیں جسے پہچان اور شناخت کہا جاتا ہے۔

فریدی صاحب کو سنتے یا پڑھتے وقت معلوم نہیں کیوں میرؔ کی یاد آتی ہے۔ کہنے کے لیے تو اس کی توجیہہ خود ارض تاج کی ادبی و شعری روایت ہے۔ جس کا فکری اور فنی حسن ایک ہی یا قریب العہد زمانوں کی فنی روایت سے مشابہت و مماثلت رکھنے کے باوصف اپنی ہر تخلیق و تمثیل میں ایک انفرادی اسلوب اور انداز ادا رکھتا ہے۔

ادب و شعر میں خان آرزو سے لے کر میرؔ اور نظیرؔ تک ہم اس میں تنوع اور تسلسل کی مثالیں تلاش کر سکتے ہیں۔ فریدی صاحب نے ان اساتذہ کی بڑی روایت شعر سے بھی فائدہ اٹھایا۔ لیکن وہ اپنی شاعری اور اس میں موجود نئی شعری صداقتوں کے ساتھ جس شاعر سے زندگی بھر قریب رہے وہ میرؔ ہے۔ اب شعوری طور پر رہے یا نیم شعوری طور پر یہ الگ بات ہے اور اس کی وجہ زندگی کا وہ سلیقہ طریقہ ہے جو انھوں نے میرؔ کی فکر اور میرؔ کے فن سے سیکھا۔

طویل بحروں میں شعر کہہ کر اور آہستہ روی کے ساتھ لفظ و معنی کے آگے بڑھتے ہوئے سلسلوں میں فقروں کی دروبست اور معنیاتی سطحوں کو جس طرح سے اپنی تخلیقی حسیت کے ساتھ وہ آراستہ کرتے ہیں اس میں وہ میرؔ ہی کے فن سے مستنیر و متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

۵ کیا ہوا جسم کے بام و در لٹ گئے دل کے آنگن میں ہنگامہ ہوتا رہے
روح کے آئینے کو سجاتے رہو بیتے لمحوں کی پرچھائیاں ہی سہی

سینہ کوبی، علاج ستم تو نہیں، دست قاتل میں تلوار رہنے نہ دو
ورنہ تلوار مانگے گی اپنا ہدف گردن و سر نہیں تو زباں ہی سہی
ہم وہی، غم وہی، پھر یہ کیا ہو گیا ہم خود اپنے لیے اجنبی ہو گئے
گردشِ وقت سے دل مگر جھوم اٹھا کچھ تو بدلا وہ رنگ جہاں ہی سہی
لذت سود و درد زیاں کا فسوں، وحشتِ دل پہ پہلے بھی چلتا نہ تھا
اور اب تو جنوں کا تقاضہ یہ ہے کچھ نہیں ہے تو جی کا زیاں ہی سہی

فقروں کی اس دروبست میں بیان کے تجربے موجود ہیں۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے آگے بڑھ کر اس میں تجربے کا وہ بیان بھی ملتا ہے۔ جو ان کی فکر اور ان کے خاص لب ولہجہ کو زندگی اور زمانے کا ترجمان بنا دیتا ہے۔

شعر تو بے تحاشا اور بے محابا بھی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن شیشۂ شعر کو جذبے کی آنچ میں دھیرے دھیرے تپانا اور Temper دینا اس میں دروں بینی کا انداز پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔

لفظ تو لغت میں بھرے پڑے ہیں۔ عام گفتگو اور ان فرمائشی تقریروں میں بھی لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں۔ جہاں الفاظ کی فراوانی اور فقروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کتنے لفظ ہوتے ہیں۔ جو کہنے والے کے اپنے ہوتے ہیں اور اس کے خارجی اکتساب کے نہیں داخلی تجسس کے آئینہ دار کہے جا سکتے ہیں۔ انھیں لفظوں کا چناؤ اور ان کے رنگ و آہنگ کی دریافت ہی تو شاعری اور شاعرانہ فنکاری ہے۔ اسی لیے فریدی صاحب نے رنگ کی بات بھی کی ہے۔ تو رنگ حنا کے وسیلہ سے، ایک لمحہ میں ہی یا ایک ثانیہ میں اس کی خوشبو نہیں مہکتی اس کے رنگ و بو کی پرتیں تو دھیرے دھیرے کھلتی ہیں۔

نکھرا ہے مرے خونِ تمنا سے ترا رنگ
مٹ کر بھی میں اے دوست وہی رنگِ حنا ہوں

برگِ حنا کا مٹنا ہی رنگِ حنا کا ابھرنا ہوتا ہے۔

اسی غزل کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔ جس کے معنی فکر کی تہوں سے ابھر کر آئے ہیں۔

بستی میں بسیرے کا ارادہ تو نہیں تھا
دیوانہ ہوں صحرا کا پتہ بھول گیا ہوں
اس دور میں انسان کا چہرہ نہیں ملتا
کب سے میں نقابوں کی تہیں کھول رہا ہوں

شاعر کی معصومیت فکر کا پتا اس سے چل جاتا ہے کہ وہ نقابوں میں انسان کا چہرہ تلاش کر رہا ہے جبکہ اس بے چہرہ تہذیب کا رخ روشن نقاب بلکہ نقابوں کے سوا کچھ نہیں۔ تہوں کا لفظ بھی فریدی صاحب کے اشعار میں ایک کلیدی علامت کے طور پر ابھرتا ہے اور اس سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کی نظر اس کی بھی قائل ہے کہ وہ آئینہ ہو یا حقیقت،

روشن و شفاف ہونے کے باوجود پردہ در پردہ اور نقاب در نقاب ہے۔

کیا عرض ہنر لفظ پرستوں میں فریدی
آئینہ کے ہاتھوں پہ حنا باندھ رہا ہوں

آئینہ کی حنابندی شاعر کی پسندیدہ اقدار زندگی کی طرف اشارہ کرنے والا لفظ ہے اور اس فکری رویے کا اظہار ہے جو لفظ کرتا ہے اور یہ لفظ پرستی سے معنی اور معنویت سے ذہن کو دور رکھنے کا ایک بڑا سبب بھی بن جاتی ہے۔ شاعر کے حساس ذہن کو قدر ہنر کے ساتھ اس کا بھی خیال آتا ہے کہ ہنر بے قدر اسی وقت ہوتا ہے جب زندگی کی قدریں ہی نہیں بدلتیں قدروں کا احساس بھی بدل جاتا ہے۔

جب کبھی قدروں کی بات چلتی ہے تو نہ جانے کیوں میر کا یہ مصرع ذہن کی سطح پر ابھر آتا ہے ع: وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے فریدی صاحب نے اسی مضمون کو بڑے اضافے کے ساتھ باندھا ہے اور یہ بندش صرف 'خیال' کی نہیں 'حال' کی مرہون منت ہے۔

وہ دست طلب ہوں جو دعا کو نہیں اٹھتا
جو لب پہ کسی کے نہیں آئی وہ دعا ہوں

دل اور دل کی بربادی کے مذکور سے زیادہ میر کے ہاں احساس کی شدت اور جذبے کی صداقت اکثر ذہن و خیال کی جس سطح کو چھوتی ہے وہ قدروں کا زوال ہے۔ جس کا احساس ہر صاحبِ شعور کے ہاں ملتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے پاس عیار گیری و قدر شناسی کے معتبر پیمانے موجود ہوں اور وہ ماضی و حال کے مابین تسلسل و توازن کے رشتے کو سمجھے اور حسن تناسب کے ساتھ اس کو اپنی زندگی اور اپنے ماحول میں برت سکے۔

فریدی صاحب کی ذہنی ٹریننگ اصحاب علم اور ارباب فن کی صحبت میں ہوئی ہے۔ کلاسکیت کا جو رچا بسا انداز ان کی شخصیت میں ملتا ہے۔ یہ کیسے کہا جائے کہ اس کا تعلق فتح پور سیکری اور ارض تاج سے نہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس میں ان کے اساتذہ کی نظر کیمیا اثر کو بھی اور حلقۂ تربیت کو نمایاں طور پر دخل ہے۔ لیکن ان سے بھی کچھ زیادہ ان کے اپنے انسانی مزاج اور شرافتِ نفس سے اس کا گہرا اور ناقابلِ شکست رشتہ ہے۔

وہ درویشانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ فقر و کج کلاہی کا ایک عجیب امتزاج ان کے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں۔ ان کی نستعلیق چال 'سموم و صبا' کے مابین ایک مخصوص انداز رکھتی ہے۔ کبھی بڑھ چڑھ کر باتیں نہیں کرتے اور اپنے برابر کے دوستوں کا بھی بڑی خوش سلیقگی اور حسنِ گفتار کے انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ اپنے اس مجموعے کے ابتدائیے میں بھی انھوں نے ایک ایک کا تذکرہ کیا ہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

شریف صاحب نے بجا طور پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فریدی صاحب نے طلب شہرت و زر کے ہنگاموں سے دور رہ کر خدمت زبان و ادب کی ہے۔ داستانوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ فارسی ادب کا انھوں نے کافی اچھا مطالعہ کیا ہے اور اردو تو جیسے ان کی ہمدم

دہم از بتی رہی ہے۔ ان کی انگریزی کی واقفیت بھی لائق تعریف ہے۔ لیکن کسی محفل، کسی مجمع میں وہ ادعائے علم کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ان کے لہجہ کی متانت، فکر کی سنجیدگی اور ان کی زبان کی شگفتگی و نرمی کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی اور ناسازگار حالات میں تو ان کی انسانی شخصیت کا وقار اور اس کا اعتبار کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔

انھوں نے گھر کے یا اپنے گھر کے دریچوں کو باغِ دہر کی طرف سے کبھی بند نہیں کیا ان کو دیکھا بھی اور ان سے وابستہ کاروانِ رنگ و بو کو اپنے دل کی دنیا سے گزرنے بھی دیا۔ ان کے جذبات کی رنگا رنگی اور فکر کی تہوں میں ہم اس کی رعنائیوں اور خوشبوؤں کو اب بھی بکھرے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

فریدی صاحب کے ہاں خوشبوؤں کا ذکرِ جمیل اسی کاروانِ رنگ و بو کی جلوہ سامانیوں کا عکس ہے جو محبوب کی حسین یاد بن کر ان کی خلوتوں کو دل کے پھولوں میں بسا دیتا ہے ؎

بسے ہوئے ہیں جو لمحے تمھاری خوشبو میں
تمھارا ذکر ہی کرتے ہیں رات بھر ہم سے

ان خوبصورت لمحوں کی طرح یہ دل آویز حسن پارے بھی دیکھیے

؎ اچانک تیری یاد آئی تو یہ عالم ہوا دل کا
چمن کا رنگ جیسے صبح کی پہلی کرن بدلے
کہاں گم ہو گیا وہ رات کا بھیگا ہوا لمحہ
جو تیرے دل کی ٹھنڈک سے مرے دل کی جلن بدلے

فریدی صاحب نے تقاضائے رنگِ غزل کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے ؎

ہے فریدی تقاضائے رنگِ غزل، ذہن کی روشنی، روح کی تازگی
شعلۂ احساس کا پیکرِ حرف میں ڈھل کے نکھرے کسی شعلہ رو کی طرح

اس سے ان کے ہاں فکر کی رعنائی اور حروف و الفاظ کی پیکر تراشی پر فنکارانہ توجہ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے لفظ کی معنوی حیثیت میں پیرایۂ اظہار شعری اہمیت اور اندازِ نظر کی طرفگی کے سہ رخی اثرات ملتے ہیں۔

؎ تری رہ گزر ہم سے روشن ہوئی ہے نشاں تیری منزل کا ہم بن گئے ہیں
یہاں کوئی نقشِ کفِ پا نہیں ہے، وفا کے چراغوں کا اک سلسلہ ہے

لمحوں کی پرچھائیاں ہوں یا وفا کے چراغوں کا سلسلہ، فریدی صاحب کے ہاں یہ پیکر تراشی کی بھی علامت ہیں اور ان کی حسین یادوں کی بھی، ان کے رنگِ تغزل کی کچھ جھلکیاں ان اشعار میں دیکھیے۔

جہاں ملا تا نہیں کوئی بھی نظر ہم سے — کلام کرتے ہیں اس گھر کے بام و در ہم سے
سفر کی آخری منزل ہے اور ہم تنہا — بچھڑ کے رہ گیا ایک ایک ہم سفر ہم سے

یوں بھی سوچ کی آخری منزل جسے ہم ذہنی سفر بھی کہہ سکتے ہیں، تنہائی ہوتی ہے۔ یہاں فریدی صاحب

کے کچھ اور اچھے شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے ان کی قدر شناسی، ان کے فنی شعور کی خوش جہتی اور ان کے ہاں معنی کے رشتوں کی شناخت میں مدد مل سکتی ہے۔ اسی طرح کے اچھے شعر ان کی ہر غزل میں مل جائیں گے۔

ذہن کو ماؤف کر دیتا ہے لفظوں کا طلسم
مدعا کہہ دیجیے، جادو بیانی پھر سہی

کس سے منت کا اپنی صلہ مانگئے، ذرہ ذرہ ہمارا ہی محتاج تھا
دشت امکاں کو ہم نے مہک بخش دی جھوم کر آہوئے مشکبو کی طرح

فکر و نظر کا یہ والہانہ پن اور زندگی کے ساتھ بے ادائی کا یہ سلوک، سچ تو یہ ہے کہ زندگی کی ادا شناسی ہی کا ایک حصہ ہے۔

ہم سے وہ ملا ہے تو کھلے دل سے ملا ہے
دنیا کو شکایت ہے کم آمیز بہت ہے

اب کاروانِ رنگ و بو دیکھیں کہاں جا کر رکے
بدلی ہوئی رفتار ہے بہکا ہوا انداز ہے

رفتہ رفتہ یہ قفس بھی آشیاں ہو جائے گا
اور کچھ دن تک قفس کو آشیاں کہتے رہو

ہمیں تو کوئی بھی پہچانتا نہیں ہے یہاں
نگاہ کس سے ملائیں کسے سلام کریں

حق یہ ہے کہ ہر اچھا شعر، ایک نئی سوچ، اور ایک نئے تجربے کا ترجمان ہوتا ہے یہ تجربے انسان اسی دنیا میں رہ کر ہی کرتا ہے۔ اس کے اپنے حالات اور ماحول ہی سے اس کا تعلق ہوتا ہے لیکن یہ شعری صداقت اسی وقت بنتے ہیں جبکہ ان میں کوئی نیا پن اور انوکھا پہلو ہو۔ اس طرح کے اشعار ایسے ہی کچھ تجربوں کی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں۔

تم اس کے فن کی داد دو جو بیچ کر اپنا ضمیر
دربار کی زینت بھی ہے بازار میں رسوا بھی ہے

اچانک تیری یاد آئی تو وہ عالم ہوا دل کا
چمن کا رنگ جیسے صبح کی پہلی کرن بدلے

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری تجربوں کی زبان ہے اور غزل ان تجربوں کا تجزیہ جن کو آدمی اپنے

مطالعہ، مشاہدے اور اپنے خیالوں اور خوابوں سے اخذ کرتا ہے۔ ان کے بیان میں اس کے وقتی موڈ، عصری کوائف اور تہذیبی فضا کا بہت کچھ دخل ہوتا ہے لیکن زیادہ تر ان ذہنی امور یا قلبی واردات کو لفظ و معنی کا پیرہن عطا کرتے ہیں اس کے خلوصِ فکر و فن کی کارفرمائیاں شامل رہتی ہیں۔ جو بہر حال روز روز نہیں بدلتا اور اسی سے شاعر کا رنگ سخن بنتا اور نکھرتا ہے۔ فریدی صاحب کے ہاں ایسے تجربوں کی مزید کچھ پرچھائیاں ملاحظہ ہوں۔ جن سے اس جذبۂ وفاداری کا بھی پتا چلتا ہے جو انھوں نے زبان و ادب کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ اور جس کا تار ان کی زندگی میں کبھی نہیں ٹوٹا کہ وہ ان کا اپنا مزاجِ زندگی بھی ہے۔

ہوائے انقلابِ دہر سے رنگِ چمن بدلے
مگر ممکن نہیں طرزِ خلوصِ فکر و فن بدلے
بیاں کے رنگ لفظوں کی قبا کے بانکپن بدلے
زباں تک آتے آتے دل نے کتنے پیرہن بدلے
گزر جاتی ہے یہ کہتی ہوئی شوخی اداؤں کی
تمھاری سادگی سے کون اپنا بانکپن بدلے

بظاہر غزل کہنا جتنا آسان ہے اس سے کہیں زیادہ وزن نگاری کا فن مشکل ہے۔ ردیف اور قافیے کی پابندی شعر کہنے اور روایت کے سہارے پر الفاظ کے سلسلوں اور تلازمات کو تلاش کرنا بھی کچھ ایسا دشوار نہیں۔ روایت کا تسلسل اور لفظوں کے ساتھ معنیاتی سطح کا تحرک کبھی تو بالکل سامنے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ غزل کہتے وقت روایت کی دام افگنی سے بچنا ہی بڑی بات ہے۔ جو قدم قدم پر فکر و خیال کے دامن کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اپنے سانچے میں ڈھال لینا چاہتی ہے۔ اکثر شاعر اس کشش بلکہ اس یورش سے بچ نہیں پاتے اور اپنے اشعار میں بے جان روایتوں کا انبار لگا دیتے ہیں۔ اسی لیے غزل میں انتخاب یا انتخابیت کا مسئلہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ لیکن ایک اچھا شاعر جو غزل کا رمز شناس ہے وہ یہ جانتا ہے کہ روایت کے سلسلوں کو عصری آگہی اور انفرادی تجربوں کے رشتوں سے کیسے وابستہ کیا جاتا ہے اور جانے پہچانے مضامین سے بھی کس طرح نئے معنی اخذ کیے جاتے ہیں۔

فریدی صاحب کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ان کی خوئے احتیاط کا پتا بآسانی چل جاتا ہے اور ایسے لوگ جو ادب کا تقابلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ وہ شعری رویّوں اور شعری روایتوں کے تناظر میں کسی بھی شعر کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ انھوں نے کہیں بھی روایت کو جوں کا توں نہیں دہرایا بلکہ اپنے استادوں کی روش و کشش سے بھی بچ کر چلنے کی اور اپنی راہ الگ بنانے کی کوشش کی ہے ہے

اے ناصحو، چارہ گرو، حد ادب سے مت بڑھو — کیسے تمھیں سمجھاؤں میں میرا ہے وہ جیسا بھی ہے
رنگِ جہاں کا عکس ہے ایک ایک چہرے پر یہاں — جو اپنے دل کا عکس ہو ایسا کوئی چہرا بھی ہے
سنگِ ملامت لے کے تم جس کو چلے ہو توڑنے — اے ناصحو! تم نے کبھی وہ آئینہ دیکھا بھی ہے

آج ہماری تخلیقی حسیت بھی بدلی اور اس معنویت کا احساس بھی تمام تر نہیں تو بہت کچھ بدل گیا جس کے وسیلے سے ہم خود کو کلاسیکی شاعری کی فضا اور اس کی رمز شناسی سے جوڑتے رہے ہیں۔ یوں بھی کچھ شعر تو ایسے ہوتے ہیں کہ ادھر وہ شاعر کی زبان سے نکلے اور ادھر سامعین نے ان کی زبان، ان کا روزمرہ، ان کی تشبیہہ، استعارے اور تلمیح سے فوری طور پر متاثر ہو کر بے اختیار اور بے تحاشہ ان کی داد دی۔ لیکن کچھ شعر ان پھولوں کی طرح جن کی پتیاں ورق در ورق اور رنگ در رنگ ہوتی ہیں۔ اپنے معنی کو اس طرح نہیں کھولتے اور اپنی معنویت کو اس سادگی سے واضح نہیں کرتے کہ بغیر توجہ کے بھی ہم ان سے لطف لے سکیں اور روایت کے سہارے ہم ان کے حسنِ بیان اور لطف زبان تک پہنچ جائیں بلکہ ان کی معنویت دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی خوشبوؤں کی پرتیں کھلتی ہیں اور خیال کے ساتھ Expand ہوتی چلی جاتی ہیں۔ فریدی صاحب کے بہت سے شعروں میں انھیں لطیف کیفیات کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے اشعار اور شعورِ زبان کا لطف بے تکلفی میں نہیں حسن تکلیف میں ہے اور جب تک کوئی قاری اس کو پرکھنے کی صلاحیت سے آراستہ ہو کر ان اشعار کو نہیں پڑھے گا وہ ان کے احساس و ادراک کے ساتھ خود کو ہم رنگ نہیں کر سکتا۔

مشاعروں کے شاعر تو فریدی صاحب ہیں ہی نہیں وہ تو جلوتوں کے مقابلے میں خلوتوں کے شاعر ہیں اسی لیے ان کے اشعار کو پڑھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذہنی خلوت نشینی اور محوِ تماشائے دماغ رہنا شاید ایک ضروری شرط ہے ؎

وہ شکست نازِ شباب کی، وہ غرورِ حسن کی بے بسی
مجھے یاد آتی ہے آج بھی تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
بڑی احتیاط سے اک نظر سر بزم تم نے اٹھائی تھی
وہ مری نظر سے بکھر گئی، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بے ارادہ جو آ گئی تھی دل فریدیؔ زار تک
وہ نظر تھی حاصلِ زندگی، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

میں اپنی بھی آواز ہوں، سب کی بھی صدا ہوں

غالباً ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کا زمانہ تھا کہ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے صدر شعبہ رشید احمد صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک جوان شیروانی میں ملبوس داخل ہوا۔ محسوس یہ ہوا کہ اس کمرے میں جتنے لوگ ہیں ان کے لیے اجنبی نہیں ہیں صرف ایک میں ان صاحب سے اور وہ مجھ سے ناواقف تھے۔ اس وقت گفتگو کسی ادبی مسئلہ پر اساتذہ کے درمیان ہو رہی تھی اور میں خاموش تماشائی تھا۔ اچانک نوجوان نے رشید احمد صدیقی صاحب سے دریافت کیا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ نے "باقیات فانی" کا جو مقدمہ لکھا ہے اس پر آپ اپنی شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ ادبی غلطیوں میں ایک غلطی وہ بھی ہے"۔ رشید صاحب نے مسکرا کے جواب دیا کہ "حضرت! ایسی افواہوں پر یقین مت کیا کیجیے میں جب اپنی نیکیوں کا شمار کرتا ہوں تو اس میں میری ایک نیکی باقیاتِ فانی کا مقدمہ بھی ہے۔" آنے والے صاحب کے سوال نے میرے چہرہ پر جو ناگواری اور پریشانی کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ رشید صاحب کے جواب نے اس تکدر کو دور کر دیا۔ تجسس ہوا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ پتا چلا کہ یہ مغیث الدین فریدی ہیں۔ ان کے سوال میں استفسار سے زیادہ شکوہ تھا مگر رشید صاحب کے جواب شکوہ نے ان کو بھی مطمئن کر دیا۔ فریدی صاحب سے میری یہ ملاقات تھی۔ میں نے ان سے خواہش کی کہ اگر مصروفیت نہ ہو تو کل صبح میرے ساتھ ناشتہ کریں جو انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ اگلے دن مداح صاحب (جو احمق پھپھوندوی کے نام سے مشہور ہیں) اور فریدی صاحب تشریف لائے۔ دیر تک شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا اور جب وہ گئے تو ایک خوش گوار تاثر چھوڑ گئے۔ درمیان میں ضمنی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہر ملاقات عقیدت اور محبت کا ایک نقش چھوڑ جاتی۔ یہاں تک کہ میں دہلی آگیا ایک دن پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے دریافت کیا کہ دہلی کالج میں ایک جگہ ہے آپ کوئی مناسب نام تجویز کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے ذہن میں مغیث الدین فریدی کا نام ہے مگر وہ اپنی جگہ چھوڑ کر آگرہ سے کیوں آئیں گے۔ فاروقی صاحب نے یہ تو نہیں کہا کہ میرے ذہن میں بھی یہی نام ہے صرف یہ کہا کہ

وہ ضیا صاحب[1] سے عقیدت اور آپ سے خلوص رکھتے ہیں اگر آپ ان کو بلانے کے لیے لکھیں تو ضرور آجائیں گے۔ میں نے تار دے دیا اور فریدی صاحب آگئے چوں کہ آگرہ کی ملازمت کے مقابلہ میں یہاں آنے میں بہت سے فائدے تھے اس لیے انھوں نے یہاں درخواست دے دی۔ کہانی بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ شعبہ کے احباب میں ایک اچھے استاد کا اضافہ ہوگیا اور آہستہ آہستہ فریدی کی پوشیدہ صلاحیتیں سامنے آنے لگیں۔ شعبہ کو ایک مخلص دوست مشفق استاد اور پرگو شاعر مل گیا۔ پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا۔ خلوت و جلوت میں ایک ہی چہرہ۔ ایک ہی برتاؤ اور ایک ہی روپ نظر آیا۔ قدرت نے ذہانت ایسی عطا کی کہ مدتوں کی بھولی بسری یادیں اس طرح بیان کرتے جیسے پردہ سیمیں پر تصویریں آرہی ہیں۔ دلچسپ فقرے۔ برجستہ شعر سن کر علی گڑھ کی محفلیں یاد آجاتی ہیں۔ فریدی صاحب خاص قسم کے علی گیرین ہیں۔ وہاں کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ خوبیاں اس لیے کہ وہ خدا کی نعمت ہیں اور خامیاں اس لیے کہ سوچتے تھے کہ اچھوں کے تو سب ہیں ان خامیوں کا قدرداں کون ہوگا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ان خامیوں میں بھی ایسا مزا تھا کہ "رشک صد ایماں ہے اصغر میر اطرز کافری"۔ فریدی صاحب بے تکلف احباب کی محفل میں ہوں یا اہل سیاست کے مجمع میں خانقاہ میں ہوں یا مدرسہ میں یا کسب معاش کی منزلوں میں۔ جہاں سے گزرے اپنی خودداری کو سنبھالے لیے گزرے۔ اس کا بڑا سبب ان کی بے نیازانہ طبیعت ہے جنھوں نے شہرت کو حاصل کرنے کے لیے کاسۂ گدائی کبھی نہیں پھیلایا اور نہ فن کا سودا دولت اور شہرت کے بدلے کیا۔

طبع فریدی کو کوئی شکوہ زمانے سے نہیں
دنیا میں وہ رہتا بھی ہے، دنیا سے بے پروا بھی ہے

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ تاریخ ادب میں خواجہ میر درد اور حالی یہ دو شاعر ایسے ہیں جن کی شخصیت ان کی شاعری کی اور شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام کی خوبیوں میں سے نفاست پسندی، سادگی، مبالغہ سے پرہیز، نرمی، گھلاوٹ، آہستہ روی اور پاکیزگی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور ان دونوں کی شخصیت کی بنیادی خصوصیات بھی یہی ہیں۔ دور حاضر میں اگر یہی بات فریدی صاحب کے بارے میں کہوں تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔ تغزل، سلاست، سلامت روی، نفاست پسندی، حساس جذبہ، شوخئی ادا ان سب نے فریدی صاحب کے کلام کی تزئین کی ہے اور ان کی شخصیت کی تشکیل میں بھی یہی معاون و مددگار رہے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ شعروں کا انتخاب رسوا کر دیتا ہے مگر شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شعروں کا انتخاب جمالیاتی ذوق کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔

ہم جس کی جھلک دیکھ کے پھر خود کو نہ دیکھیں
ایسا کوئی دنیا میں طرح دار کہاں ہے

---

[1] مولانا ضیا احمد صاحب بدایونی مرحوم (میرے والد)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے فریدی صاحب کے بارے میں دلچسپ بات لکھی ہے۔

"ان کی (فریدی صاحب) غزلوں میں وہ کلاسکی رچاؤ ہے جوان کو پروفیسر حامد حسن قادری اور حضرت میکش اکبرآبادی کی ادبی صحبتوں سے ملا۔ وہ حسن وتناسب اور خوش آہنگی ہے جو ارضِ تاج کی دین ہے۔ وہ ادب وہ شائستگی، وہ دھیما دھیما سوز جو حضرت سلیم چشتیؒ کی بارگاہ کا فیضان ہے۔ وہ تازگی، شگفتگی اور جدت طرازی ہے جو علی گڑھ کی تعلیم اور اس کے علمی ماحول کا نتیجہ ہے۔"

اور اس پر دہلی کے اس ماحول کا اور اضافہ کر لیجیے جس نے کام کرنے کا جذبہ اور بصیرت و بصارت کے چراغ روشن کر دیے۔

فریدی صاحب کا مجموعۂ کلام "کفر تمنا"، شائع ہو کر اہلِ ذوق کے ہاتھوں میں پہنچا کسی نے اس کی ترکیب کو الٹ دیا اور "تمنائے کفر" سے تعبیر کیا۔ شریف صاحب[1] کا خیال ہے کہ "کفر تمنا" اعتراف ایمان کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس مجموعہ کو پڑھیے تو وہ تمام خصوصیات نظر آجائیں گی جن کی طرف فریدی صاحب کی شخصیت کی تشکیل کے سلسلہ میں ذکر آیا۔

مجھے فریدی صاحب کے مجموعۂ کلام میں سب سے زیادہ ان کے جمالیاتی طرز ادا اور طرز فکر نے متوجہ کیا جو خوب سے خوب تر کا متلاشی رہتا ہے۔ ماحول کا ذکر ہو یا عشق و محبت کی داستان، یہ جمالیاتی احساس ان کو راستہ دکھاتا ہوا چلتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان کے نظریہ شعر اور فن کی بخوبی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

ہے فریدی تقاضائے رنگِ غزل ذہن کی روشنی، روح کی تازگی
شعلۂ احساس کا پیکر حرف میں ڈھل کے نکھرے کسی شعلہ رو کی طرح

ہمیں اس انقلاب دہر کی دعوت نہ دو جس میں
نہ پھولوں کی مہک بدلے، نہ کانٹوں کی چبھن بدلے

شخص فانی ہے فریدی، فن مگر فانی نہیں
فن کے ہر لمحہ کو عمر جاوداں کہتے رہو

فریدی صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں جس کا اظہار انھوں نے خود بھی کیا ہے۔

ہزار شیوے تھے گفتگو کے، ہزار انداز تھے سخن کے
مگر یہ ایما تھے دل فریدی فدائے رنگ غزل رہا ہے

غزل اپنے تنوع اور ہمہ گیریت کے باوجود جس سے منسوب کی جاتی ہے وہ مضامین حسن و عشق ہیں۔ فریدی صاحب کے یہاں عشقیہ مضامین کا اظہار بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہوا ہے۔ ان اشعار میں تغزل بھی ہے اور احساس رنگ بھی ہے۔ ذیل کے اشعار ہمارے دعوے کی تائید کے

---

[1] ڈاکٹر شریف احمد، شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

لیے کافی ہیں ؎

گزر جاتی ہے یہ کہتی ہوئی شوخی اداؤں کی
تمھاری سادگی سے کون اپنا بانکپن بدلے
اچانک تیری یاد آئی تو وہ عالم ہوا دل کا
چمن کا رنگ جیسے صبح کی پہلی کرن بدلے
سنگِ ملامت لے کے تم جس کو چلے ہو توڑنے
اے ناصحو! تم نے کبھی وہ آئینہ دیکھا بھی ہے
لب تک آتے نہ فریدی غمِ دوراں کے ستم
حلقہ بن کر خمِ گیسوئے بتاں تک پہنچے
کبھی جو شام کو مہکی کسی کی زلفِ رسا
تو یاد آئی وہیں تیرے جسم کی خوشبو

فریدی صاحب کا پورا کلام پڑھ جایئے وہاں نہ عشق کی بے جا طرفداری ہے اور نہ رقیب سے کوئی جھگڑا۔ واعظ اور ناصح سے کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ نظر آتی ہے مگر وہ بھی ان کا مزاج نہیں ہے۔ محبوب سے زیادہ اس کے حسن اور عاشق سے زیادہ اس کے جذبۂ عشق کا ذکر ہے اور یہ وصف ان کو حسرت کے مزاج سے قریب کر دیتا ہے۔ رشید صاحب نے حسرت کے بارے میں لکھا ہے۔

"انھوں نے اپنی عاشقی کو قضیۂ زمین برسرِ زمین ہی رکھا۔ اس کو نہ آسمان پر لیے لیے پھرے نہ خانقاہوں اور ویرانوں میں بھٹکنے دیا۔ اپنے عشق کو نہ گالو سدھار کا حیلہ بنایا نہ بغاوت اور انقلاب کا وسیلہ۔ نہ یزداں اور اہرمن کا مسئلہ"

کیا ان اوصاف میں فریدی صاحب حسرت سے متاثر نظر نہیں آتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فریدی صاحب فانی کے حزنیہ لہجہ سے متاثر ہیں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ جدید شعرا کی فہرست میں فریدی صاحب کے یہاں سب سے زیادہ احترام فانی کی شاعری کا نظر آتا ہے اور انھوں نے مروتاً یا تکلفاً نہیں بلکہ صدق جذبات سے اپنی عقیدت کا اظہار ان تضمینوں میں کیا ہے جو فانی کے کلام پر تخلیق کی ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو فانی کا شعر ہے ؎

قطرہ کیا، موج کسے کہتے ہیں، کیسا گرداب
ڈوب کر دیکھ، نہ دریا ہے نہ طغیانی ہے

فریدی صاحب کی تضمین کی خوبی یہ ہے کہ فانی کے شعر سے اپنا شعر ہم آہنگ کر دیا ہے

بحرِ الفت میں کہیں بھی نہیں ساحل نایاب
وہم نے ڈال دیا ہے رخِ ساحل پہ نقاب
ہمتِ عشق اگر ہے تو اٹھا دے یہ حجاب

قطرہ کیا، موج کسے کہتے ہیں، کیسا گرداب
ڈوب کر دیکھ نہ دریا ہے نہ طغیانی ہے

تضمین کا جب ذکر چھڑ گیا ہے تو دو مثالیں اور پیش کرنا چاہوں گا۔ فیض کا شعر ہے ؎

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

فریدی صاحب کے مصرعے کس طرح شعر سے پیوست ہو گئے ہیں۔

اپنی آہوں سے بجھاتے ہیں امیدوں کے چراغ
بے طلب جب بھی ملا توڑ دیا ہم نے ایاغ
غیرتِ عشق کا دامن ہے ابھی تک بے داغ
کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

غالبؔ کے شعر پر فریدی صاحب کے جرأت رندانہ کی داد دیجیے۔

ہر سر میں ہے ہوائے محبت بھری ہوئی
پہلے تو اتنی عام یہ جنس گراں نہ تھی
موتی کی آب سیپ کے ٹکڑوں نے لوٹ لی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

فریدی صاحب کے کلام کی ایک اہم خصوصیت وہ کرب اور بے چینی ہے جو ان کو اپنے ماحول کی بے اطمینانی کے باعث ہے مگر اس کرب اور بے چینی میں بھی وہ اپنے شعر کو نعرہ بازی یا دشنام طرازی کا ہدف نہیں بننے دیتے۔ یہ کرب ان کے یہاں کیوں آیا اس کا جواب صاف ہے۔ ایک حساس انسان جب اپنے گرد و پیش میں وہ سب کچھ دیکھتا ہے جس کی وہ اُمید نہیں کرتا تھا تو دل کے درد کا شعر کے سانچے میں ڈھل جانا ناگزیر ہوتا ہے۔

اس دور میں انسان کا چہرہ نہیں ملتا — کب سے میں نقابوں کی تہیں کھول رہا ہوں
کیا عرض ہنر لفظ پرستوں میں فریدی — آئینے کے ہاتھوں پہ حنا باندھ رہا ہوں

وقت کے ساتھ قدریں بدلتی رہیں، مصلحت ہر قدم پر ڈبوتی رہی
غیرت دل اگر یونہی سوتی رہی، جان بھی جائے گی آبرو کی طرح

اس کرب و اضطراب میں جہاں سماجی ناہمواری کا احساس ہے وہاں سیاست کی افراتفری نے بھی ان کو متاثر کیا ہے۔

تیغ کس کے ہاتھ میں تھی کون تھا سینہ سپر — یہ کہانی آج سن لو، وہ کہانی پھر سہی
سلوک ایسا کیا ہے راہزن نے — نگاہیں جھک گئی ہیں رہبروں کی
پڑوسی کو جو طعنے دے رہے ہیں — خبر لیتے نہیں اپنے گھروں کی

کتنا کرب اور طنز ہے ان اشعار میں۔ معنی کی تہیں کھولتے جایئے ہندستان کا نقشا بنتا چلا جائے گا۔

رفتہ رفتہ یہ قفس بھی آشیاں ہو جائے گا
اور کچھ دن تک قفس کو آشیاں کہتے رہو
تیز ہیں خنجر ابھی بازوئے قاتل شل نہیں
قتل گاہوں کو مگر دار الاماں کہتے رہو

رت بدلتی رہی، رنگ اڑتے رہے کم نظر باغباں کم نظر ہی رہے
اک خیاباں کو سیراب کرتے رہے آبروئے بہارِ چمن بیچ کر

جب بات یہاں تک پہنچی تو شاعر سے ضبط نہ ہو سکا۔ ظالم اور مظلوم دونوں کے لیے اس میں تنبیہہ موجود ہے۔

سینہ کوبی علاج ستم تو نہیں، دستِ قاتل میں تلوار رہنے نہ دو
ورنہ تلوار مانگے گی اپنا ہدف، گردن و سر نہیں تو زباں ہی سہی

اس تندی و تلخی کے بعد پھر لہجہ نرم پڑ جاتا ہے۔

کسی نے زبانِ تمنا نہ سمجھی، غلط فہمیوں سے بڑھی بے نیازی
ذرا جس کو چشمِ عقیدت سے دیکھا وہی رفتہ رفتہ خدا بن گیا

تیر تو سب تمھارے خطا ہو گئے، توڑ دو اب یہ خالی کماں دوستو
آؤ بڑھ کر گلے سے لگا لو ہمیں ورنہ پھر تم کہاں، ہم کہاں دوستو

شاعری شاعر کے شعور اور تحت الشعور کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ بقول رشید صدیقی صاحب "قاری صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس نے اپنے اس شعور یا تحت الشعور کا اظہار کس سطح پر اور کس نیت سے کیا ہے۔" اور یہی بات شاعر کے درجہ کو متعین بھی کرتی ہے۔ اشعار بالا کو پڑھ کر ہر شخص بین السطور میں سب کچھ پڑھ سکتا ہے۔ یہ سب زندگی کی مختلف تصویریں ہیں اور فریدی صاحب ان سب کا مرکزی کردار ہیں۔ یہ مرکزی کردار اس ماحول سے بے اطمینانی کا اظہار تو کرتا ہے، مگر نفرت نہیں کرتا۔ وہ طنزیہ لہجہ تو اختیار کرتا ہے مگر اس میں جھلاہٹ نہیں ہے۔ اگر حزنیہ لے ہے تو زندگی کی صحت مند بشارت کے لیے ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ ان میں ماحول کا کرب بھی ہے اور ذاتی غم بھی، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے یہاں احترام غم بھی ہے۔ جس کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ فانی سے قریب ہیں۔ ان "تیز ہواؤں" میں بھی انھوں نے "شمع وفا" کی لو کو بجھنے نہیں دیا ہے۔

اک بار بھی تھرائی نہ لو شمع وفا کی
سنتے تھے زمانے کی ہوا تیز بہت ہے

مجھے احساس ہے کہ اشعار کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے مگر ان مثالوں کے بغیر شاید میں اپنی بات

پورے طور پر ادا نہ کر پاتا۔ آپ نے غزل میں رنگ فریدی کو دیکھا مگر ایک فریدی اور بھی ہیں جو اپنے تاریخی قطعات میں نظر آتے ہیں اور خاص طور پر ان کے بے تکلفانہ قطعات جن میں واقعات کے ساتھ ساتھ واقعہ کی ندرت اور شعر کا جمالیاتی رچا ہوا انداز نظر آئے گا۔ ان کی شوخی اور بات میں بات پیدا کرنے کی ادا ان قطعات میں اس طرح نظر آئے گی کہ جس قدر معنی پر غور کیا جائے اسی قدر اس میں نئے نئے معنی نکلتے چلے آئیں گے۔ ان تاریخی قطعات پر کسی وقت تفصیل سے لکھوں گا۔ بہت سے قطعات ایسے ہیں جو اپنے پس منظر کے اظہار کا مطالبہ کریں گے۔ ان میں کچھ گفتنی بھی ہیں اور کچھ صرف بے تکلف احباب کی محفل میں سنانے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں ان کا موقع نہیں۔ زبان و بیان پر قدرت کے علاوہ فن تاریخ گوئی پر ایسا ملکہ حاصل ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ مصرعے اپنے اعداد کے ساتھ الہامی طور اتر رہے ہیں اور لطف یہ کہ ان میں کہیں بھی آورد کا احساس نہیں ہوتا۔ تعمیہ اور تخرجہ کا استعمال بھی اس حسن و خوبی سے ہوا ہے کہ کہیں اجنبیت نہیں معلوم ہوتی۔ فیض کی وفات پر سات اشعار کا قطعہ لکھا تھا۔ عنوان تھا "سادہ طبع فیض احمد فیض" آخری دو شعر تھے۔

۱۹۸۴ء

دست اجل سے اور بھی کج ہو گئی تیری کلاہ
تو نے غرور عشق کو بخشا کچھ ایسا بانکپن
خوشبو ترے اشعار کی دست صبا میں بس گئی
تاریخ بن کر رہ گیا "لطف غزل، حسن سخن"

۱۹۸۴ء

جوش ملیح آبادی شعبہ اردو میں تشریف لائے تو ان کے ہی مصرعہ سے تاریخ نکالی۔

یہ کون آیا کہ بزم شعر و نغمہ جگمگا اٹھی — صدائے قلقل مینا میں کس کا نام ہے ساقی
دل و دیدہ ہوئے جاتے ہیں فرش راہ مے خانہ — جھکی مینا کی گردن خم ادب سے جام ہے ساقی
پئے تاریخ مصرع جوش کا بڑھ کر "صبا" نکلی — "کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی"

۹۳ ۔ ۹۳ - ۲۰۵۰ : ۱۹۵۷ء

ایک دوست کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ برجستہ قطعہ تاریخ ہوا۔ تاریخ میں قدوائی صاحب (پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی) کے مزاج کا عکس بھی نظر آئے گا۔ تاریخ دلچسپ ہے اس لیے پورا قطعہ ملاحظہ ہو۔

سچ ہے انساں کو بگڑتے دیر کچھ لگتی نہیں
سیدھا سادا اپنا قدوائیؔ بھی پُرفن ہو گیا
وہ محقق بھی ہوا ہے اور دانش مند بھی
وزن تھیسس کا اگرچہ بڑھ کے دو من ہو گیا

لہ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی جن کا تحقیقی مقالہ ڈاکٹر گل کرسٹ پر ہے

گل کرسٹ اس کا مزاج خانقاہی ہے گیا
قہر ہے پیر کلیسا مر کے رہزن ہوگیا
مصرع مومن میں پنہاں سال تھا تاریخ کا
اک ذرا سے تخرجہ سے آج روشن ہوگیا
خانقاہِ بے نیازی کا "مجاور" کم ہوا
"ایک شیخ وقت تھا وہ بھی برہمن ہوگیا
۲۵۰

۲۵۰ - ۲۲۲۰ = ۱۹۷۰ء

بہر نوع مغیث الدین فریدی کا کلام جب اہل ذوق کے ہاتھ میں پہنچے گا تو مجھے یقین ہے کہ فریدی صاحب کو یہ شکایت نہیں رہے گی ؎

ہمیں تو کوئی بھی پہچانتا نہیں ہے یہاں
نگاہ کس سے ملائیں، کسے سلام کریں

ڈاکٹر محمد فیروز

فریدی صاحب اور تاریخ گوئی

تاریخ گوئی اُردو شاعری کی ایک قدیم اور مقبول روایت رہی ہے۔ قدیم اساتذہ کے دواوین کے آخر میں قطعاتِ تاریخ کا شامل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کم سے کم انیسویں صدی کے آخر تک اُردو کی ہر تصنیف کا سال طباعت کسی قطعۂ تاریخ کی صورت میں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہر شاعر سے تاریخ گوئی کا بھی مطالبہ ہوتا تھا۔ غالبؔ نے ان مطالبوں سے گھبرا کر طرح طرح سے معذرت کی اور اپنے خطوں میں یہاں تک لکھ دیا کہ میں فنِ تاریخ سے بیگانۂ محض ہوں حالاں کہ ایسا نہیں تھا۔ غالبؔ تاریخ گوئی سے گھبراتے ضرور تھے مگر انھوں نے اس فن میں بھی اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس روایت کی وضاحت کرتے ہوئے فریدی صاحب نے لکھا ہے کہ "تاریخ گوئی کا فن نفس انسانی کی ایک اہم ضرورت اور تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ اہم واقعات اور قابلِ ذکر حادثات کا سن و سال یاد رکھنے کے لیے عدد کو الفاظ کا سہارا دیا گیا اس طرح وہ قاعدہ ایجاد ہوا جسے آج حساب ابجد یا تاریخ کی اصطلاح میں قاعدۂ جمل کہتے ہیں۔ حافظ کو بیدار رکھنے کے لیے اس کا رشتہ شعر سے جوڑ دیا گیا تاکہ کلام موزوں کو قوتِ حافظہ آسانی سے قبول کر کے اپنے نہاں خانے میں محفوظ کر لے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ اس فن کی ابتدا عرب میں ہوئی اس کے بنیادی قاعدے مقرر ہوئے۔ اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ اہل عجم نے اسے صنعتوں سے آراستہ کیا اُردو میں تاریخ گوئی بھی علمِ بیان و بدیع کی طرح فارسی سے آئی، ہندوستان میں مغل بادشاہوں نے دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح اس فن کی بھی سرپرستی کی اور نادر تاریخوں پر بیش بہا صلے عطا کیے اس سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا نے اس فن پر غیر معمولی توجہ اور محنت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کا مذاق اس قدر عام ہوا کہ بادشاہ اور امرا کی طرح عوام بھی اس فن میں دلچسپی لینے لگے بچوں کے تاریخی نام، ولادت، وفات، جشن، جلوس، فتح و شکست، کامرانی و نامرادی، تقاریب، تعمیر، تالیف و تصنیف کے علاوہ ہر اس واقعہ کے لیے جو ذرا سا بھی اہم، دلچسپ یا عجیب ہوتا تاریخ گو سے تاریخ کی فرمائش کی جاتی تھی اور یہ بھی ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش کے بھی تاریخ کہہ کر پیش کر دیا کرتے تھے۔ تاریخ اچھی ہوتی تھی تو امیروں سے انعام اور عوام سے داد حاصل کرتے تھے۔ اُردو شاعری کے آغاز سے عہدِ غالبؔ تک اس فن نے حیرت انگیز ترقی

کی. فارسی کا اثر ایسا غالب تھا کہ اردو کے بیشتر شعرا کی تاریخیں فارسی میں ہیں کہیں قطعے کے اشعار اُردو میں ہیں اور مادۂ تاریخ فارسی میں ہے۔"

امیرؔ و داغؔ دہلوی تک تاریخ گوئی کا عروج رہا۔ اس کے بعد مُلک کے سیاسی، سماجی حالات جس تیزی سے بدلے کچھ ایسی ہی تبدیلی شعر و ادب میں بھی آئی۔ غزل معتوب ہوئی اور حقیقت پسندی کے رجحان نے بعض اصنافِ سخن کو پس پشت ڈال دیا۔ تاریخ گوئی وقت کی تیز آندھی کی نذر ہوئی۔ یوں ہر دور کے شاعروں نے اسے ہنرمندانہ اور فنکارانہ طور پر برت کر نہ صرف بہت سے شعرا ادبا کی تواریخ وفات کو نظم کیا بلکہ متعدد گوناگوں اہم سیاسی، سماجی اور تہذیبی واقعات و سانحات کو بھی لطیف، پُراثر اور تازہ الفاظ میں اسیر کر دیا اس طرح کی کوششوں سے تاریخ گوئی، سانس لیتی رہی لیکن وہ اچھی شاعری سے کٹ کر محض اعداد شماری کا وسیلہ بن گئی ایسی تاریخ گوئی اچھی شاعری سے کٹ کر، اپنا جواز کھو بیٹھتی ہے۔ چنانچہ چند مستثنیات سے قطع نظر گذشتہ نصف صدی میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تاریخ گوئی ایک اخلاقی فریضہ کا دوسرا نام ہو چکی ہے۔

تیس برس پہلے اُردو تاریخ گو کی حیثیت سے مولانا حامد حسین قادری صاحب کی قدآور شخصیت سامنے آئی جو اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے تاریخ کہتے تھے اور اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔

قادری صاحب کے بعد مغیث الدین فریدی صاحب نے "تاریخ گوئی" پر خصوصی توجہ دی ان کی یہ توجہ اور دلچسپی شاید قادری صاحب کی ہی قربت کا نتیجہ ہے۔

فریدی صاحب کی تاریخیں برائے یادداشت سن وسال نہیں بلکہ ان کی قادر الکلامی کا نمونہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر شریف احمد صاحب وہ نہ صرف علم الاعداد میں چھپے "رومان" سے واقف ہیں بلکہ انھیں اعداد کو لفظوں کے جادو میں سمودینے کا ہُنر بھی آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فریدی صاحب کی اچھی تاریخیں بھی ہیں، اور اچھی شاعری بھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ فریدی صاحب تاریخ گو کی حیثیت سے جتنے مشہور ہیں اتنے بحیثیت شاعر مقبول نہیں حالاں کہ وہ گذشتہ ۵۰ سال سے شعر کہہ رہے ہیں اور ان کی تاریخ گوئی کی عمر بیس بائیس سال ہے۔

فریدی صاحب کے بحیثیت شاعر مقبول نہ ہونے میں ان کی اپنی گوشہ نشینی کو بہت بڑا دخل ہے۔ گذشتہ ۲۵ سال سے وہ تقریباً خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں مقامی مشاعروں میں سال دو سال میں کہیں چلے جاتے ہیں مدیران رسائل کے طلب کرنے پر ہی وقتاً فوقتاً اپنا کلام بغرضِ اشاعت بھیجتے ہیں بصورت دیگر احباب کے اصرار پر، طلبہ کی درخواست پر کبھی کبھی شعر سُنا دیتے ہیں اللہ اللہ خیر صلا۔

ایک زمانہ تھا جب فنکاروں کی مُلکوں مُلکوں تلاش ہوتی تھی دُور دُور سے اہلِ فن اور اہلِ ہنر بلائے جاتے تھے آج ہر شخص کو خود لاؤڈ اسپیکر بننا پڑتا ہے جس نے یہ راز جان لیا

کھا کما لیا۔ جو متاعِ فن و ہنر لیے خاموش گھر میں بیٹھا رہا اُسے کسی نے نہ پوچھا فریدی صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب پستہ قد بونوں کے بل اُچک اُچک کر اپنا قد بڑھا رہے ہوں تو سچّا فنکار اس مقابلے سے خود بخود پیچھے ہٹ جاتا ہے اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ اس طرح پیچھے ہٹنا "خود حفاظتی" ہے مگر مشینی عہد میں یہ ایثار بے اثر ہو جاتا ہے پستہ قد کسی دراز قد کے نہ ہونے سے میدان مار لیتے ہیں۔

فریدی صاحب کی گوشہ نشینی (جس میں ان کے ذاتی حالات کا بڑا دخل ہے ان کا بڑا لڑکا عمر ۲۹ بچپن سے ذہنی طور پر معذور رہے) نے انھیں "کساد بازاری" سے تو محفوظ رکھا لیکن انھیں نقصان بھی پہنچایا۔ وہ شخص جس نے مجروحؔ، شکیلؔ، جذبیؔ، جگرؔ اور تاباںؔ کے ساتھ مشاعرے پڑھے ہوں فانیؔ، حسرتؔ، سیمابؔ اکبرآبادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے اکابر سے داد پائی ہو وہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں نسبتاً گمنام ہو کتنی عجیب بات ہے!؟

بہر حال یہ تو جملۂ معترضہ تھا ذکر تھا تاریخ گوئی کا۔ میرے علم و یقین کے مطابق فریدی صاحب آج برِ صغیر ہند و پاک میں منفرد اور ممتاز تاریخ گو ہیں۔ جن حضرات نے ان کی تاریخیں پڑھی یا سنی ہیں وہ میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے۔ جن حضرات کو یہ موقع نہیں ملا ان کی ضیافت طبع کے لیے چند تاریخیں پیش کرتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ فریدی صاحب کی تاریخیں محض تاریخیں نہیں ان کے فکر و فن کا اظہار بھی ہیں۔

خالد حسن صاحب قادری نے تیسری شادی کی تو فریدی صاحب نے اس عقدِ ثالث پر تہنیتی تاریخ کہی ہے

سنت پہ کر رہے ہیں خالد حسن عمل پھر
پابندِ حکمِ حق ہے اللہ کا نیک بندہ
تاریخ عقدِ ثالث مل جائے ہم کو فوراً
آجائے ان کے لب پر جب "تین بار خندہ"
۶۵۹

۶۵۹ تین مرتبہ جمع کیا جائے تو سال ۱۹۷۷ء نکل آتا ہے۔

راقم الحروف کو گذشتہ کئی سال سے فریدی صاحب کی نیاز مندی کا شرف حاصل ہے اس لیے ایسے بہت سے مواقع آئے کہ کسی بھی واقعہ یا خبر کو سن کر فریدی صاحب نے منٹوں سیکنڈوں میں تاریخ کہہ دی۔ دو سال پیشتر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی میں راقم الحروف کی موجودگی میں صرف چند منٹ میں موصوف نے ایک دلچسپ تاریخ کہی ڈاکٹر شریف احمد صاحب نے فریدی صاحب کو بتایا کہ "کل رات پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب کے اعزاز میں ڈنر تھا مگر وہاں عابدی صاحب نہ تھے، یہ ایک تاریخی بات ہے ہو جائے اس پر تاریخ"۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے تاریخ ہو گئی میں نے گھڑی دیکھی یہ تاریخ کہنے میں تین منٹ صرف ہوئے تھے۔

بزم میں تھی اس قدر بے رونقی
مقتدی تھے مولوی صاحب نہ تھے

"دل" سے یہ تاریخ نکلی دفعتاً
کل ڈنر تھا عابدی صاحب نہ تھے

۳۴ + ۱۳۶۸ = ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء

مصرعہ تاریخ کہتے ہوئے عام طور پر "مطلوبہ اعداد" پورے نہیں ہوتے یا تو کچھ کم ہو جاتے ہیں یا پھر بڑھ جاتے ہیں چنانچہ مادہ تاریخ میں کچھ عدد شامل کرنے کو تعمیہ تدخلہ، کہتے ہیں اور زائد عدد کو کم کیا جائے تو اس عمل کی اصطلاح کو تعمیہ تخرجہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مصرعہ تاریخ سے پہلے یا اسی مصرعہ میں اعداد گھٹانے یا بڑھانے کا لطیف اشارہ یا کنایہ ہو۔ یہ اشارہ جتنا لطیف ہوگا تاریخ اتنی ہی عمدہ ہوگی۔ مثال کے طور پر حکیم مومن خاں مومن نے اپنی بیٹی کی تاریخِ ولادت میں تعمیہ تخرجہ کا انتہائی خوبصورت استعمال کیا ہے

"نال" کٹنے کے بعد ہاتف نے
کہی تاریخ "دخترِ مومن"

دختر مومن کے اعداد تیرہ سو چالیس ہوتے ہیں۔ اس میں سے "نال" کے اعداد اکیاسی تخرجہ کر دینے سے ۱۲۵۹ھ بر آمد ہوتا ہے یہی سالِ ولادت ہے۔

فریدی صاحب نے بیس بائیس سال میں تین سو سے زائد تاریخیں کہی ہیں جن میں سے بیشتر بالکل صاف ہیں۔ ان میں "تعمیہ" نہیں جن تاریخوں میں تعمیہ کی مجبوری ہے وہاں انھوں نے اس لفظ کا انتخاب کیا ہے جو شعر کی ضرورت بن کر سامنے آیا ہے محض اعداد گھٹانے یا بڑھانے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ اچھی تاریخیں وہی مانی جاتی ہیں جن کے مادۂ تاریخ برجستہ اور شعر کا حصہ بن کر سامنے آئیں۔ محض تاریخ نکالنے کے لیے چند الفاظ کو یکجا نہ کیا جائے۔ چناں چہ فریدی صاحب کی کہی ہوئی تاریخیں اتنی برجستہ ہیں کہ ان کے مادۂ تاریخ پہلی ہی قرأت میں یاد ہو جاتے ہیں۔ ان مصرعوں یا مادۂ تاریخ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ مصرعے فریدی صاحب کے اپنے نہیں بلکہ مشہور و معروف شعرا کے مقبولِ خاص و عام شعروں کے مصرعوں سے تاریخ نکالی ہے۔

شاہ فیصل کو ان کے بھانجے نے شہید کیا تھا۔ فریدی صاحب نے اس سانحے کی تاریخ مشہور مصرعے سے نکالی ہے

اس کو شہادتِ شہ فیصل کا غم ملا
سنبھلی نہ تھی جو قوم ابھی ناصر کے داغ سے
تاریخ قتلِ شاہ ملی ہے "یکا" کے ساتھ
"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

۲۳ + ۱۹۵۲ = ۱۹۷۵ء

تاریخیں تعزیتی بھی ہوتی ہیں، تہنیتی اور تفریحی بھی۔ فریدی صاحب سے عام طور پر لوگ تفریحی تاریخوں کی فرمائش کرتے ہیں یہ تاریخیں انتہائی شگفتہ اور رواں دواں بھی ہوتی ہیں اور طنز و مزاح

کالطیف امتزاج بھی۔ ایک شادی کی تفریحی تاریخ ملاحظہ فرمائیں
اس شادی کی خصوصیت یہ تھی کہ دولھا دلھن دونوں ہی ادھیڑ عمر تھے ؎

پایا اثر دعا نے خدا کی جناب سے
سب فیض یاب ہیں کرم بے حساب سے
دونوں گزر گئے ہیں جو حدِ شباب سے
تاریخ عقد مل گئی لفظ "خضاب" سے
۱۴۰۳ھ

لفظ "خضاب" سے نہ صرف یہ کہ تاریخ سالِ شادی ۱۴۰۳ ہجری بر آمد ہوگئی۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عمر کے کس حصے میں شادی ہوئی ہے۔

محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے عرس کے موقع پر تعمیہ کے ساتھ فریدی صاحب نے تاریخ کہی یہ تعمیہ نہ صرف اعداد پورے کرتا ہے بلکہ اس میں زیارت کرنے والے کی اپنی عقیدت بھی شامل ہے۔

تبسم ہیں ترے دنیا کی رحمت ادائے لطف ہیں عالم پناہی
کہی "چادر" چڑھاکر میں نے تاریخ "نظام الدین محبوب الٰہی"
۲۰۸ + ۱۱۹۰ = ۱۳۹۸ ہجری

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دلی کی تاریخ پر نظام خطبات دہلی یونی ورسٹی کے سلسلہ میں جو مقالے پڑھے تھے اُن کا عنوان اوراق مصور میر تقی میر کے مشہور مصرع سے ماخوذ ہے۔ یہ عنوان پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے تجویز کیا تھا۔ یہی شاعرانہ عنوان اس تاریخ کا محرک بن گیا ؎

خطباتِ نظام کی یہ تقریب
تاریخ ادب میں ہے گرامی
آئے ہیں یہاں خطاب کرنے
با دانش و فضل و نیک نامی
"بکشاد" برائے سالِ تاریخ
اوراقِ مصورِ نظامی
۳۲۷ + ۱۶۴۵ = ۱۹۷۲ء

۱۹۷۱ء میں فروغ اُردو لکھنؤ کا عبد الماجد دریابادی نمبر شائع ہوا۔ اس وقت فرقت کاکوروی مرحوم زندہ تھے ان کی فرمائش پر یہ تاریخ ہوئی۔

تیرے قلم نے بزم ادب میں فکر رسا کی شمع جلادی
شعر سے بڑھ کر تیرے فقرے نثر کی عظمت تو نے بڑھادی
حسنِ بیاں سے طرزِ ادا سے نثر کے آئینے کو جلا دی
تو ہی فروغِ شمع سخن ہے مرشد اُردو! نثر کے ہادی

رہبر عالی ۔ فاضل ناقد "عبد الماجد دریا بادی"

۱۹۷۱ء

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی کار چوری ہو گئی لیکن خوش قسمتی سے ایک ماہ بعد مل گئی اس خوشی میں یہ تاریخ ہوئی ہے

یہ کرامت ہے ظہیر احمد صدیقی کی
مل گئی کھوئی ہوئی کار ہوا دل کو سکوں
مصرعِ حضرتِ غالب سے ملی مجھ کو مدد
فکر تھی مجھ کو کہ میں کار کی تاریخ کہوں
کار مسروقہ یہ کہہ کر ہوئی "زیب منزل"
۱۴۶
"میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں"
۱۲۵۴

اس مادہ تاریخ میں ۴۶ ۱۴ عدد کم ہیں جسے "زیب منزل" کے تعمیہ تدخلہ سے پورا کیا گیا ہے جس کے عدد ۱۴۶ ہیں اس طرح تاریخ سال ۱۴۰۰ھ برآمد ہوئی۔

فریدی صاحب نے اپنے بیٹے شاہد کے لیے جون ۱۹۶۹ء میں طوطا خریدا جو دوسرے دن مر گیا۔ فریدی صاحب نے اس کی نادر تاریخ کہی ط و ط ا ۔ ہر حروف کے نیچے اس کے عدد بالترتیب لکھیں جائیں تو سالِ وفات ظاہر ہو جائے گا ط و ط ا

۹ ۶ ۹ ۱ء

فریدی صاحب کی کہی ہوئی بے شمار تعزیتی تاریخوں میں چند تاریخیں درج ذیل ہیں اِن قطعات میں نہ صرف، مرحومین، کی تاریخ وفات محفوظ ہو گئی ہے بلکہ ان کی شخصیت بھی اُبھر آئی ہے۔

قطعۂ تاریخ

۱۳۹۵ ہجری

بروفاتِ سحر زباں مرزا محمود بیگ

۱۳۹۵ ہجری

مرزا محمود بیگ کے دم سے	وضع داری کے نقش روشن تھے
اُن کے کردار سے تھے تابندہ	رنگ تہذیب اور شرافت کے
وہ تھے دلّی کے، دلّی ان کی تھی	وہ یہاں سب کے دل میں رہتے تھے
سونی سونی بساطِ محفل ہے	بس وہی تھے جو صدرِ محفل تھے
ان کی رحلت کے بعد ہر دن میں	جل رہے ہیں چراغ یادوں کے

ہے یہ غم سے "ملول" سالِ وفات
"مرزا توشہ تھا اور دلّی برات"
۱۹۷۵ = ۱۸۶۹ + ۱۰۶

نوحۂ غلام احمد فرقت کاکوروی

تازہ تھا زخم احتشام حسین
ہم سے فرقت بھی چھن گئے ہیہات
اُٹھتے جاتے ہیں بزم اُردو سے
صاحبانِ کمال و اہلِ صفات
مرگِ فرقت ہے مرگِ لطفِ بیاں
تھا وہ شیریں زباں و خوش اوقات
دم ظرافت نے آج توڑ دیا
مرگِ فرقت مزاح کی ہے وفات
باوجودِ مصائب و آلام
ہنس کے لکھتا تھا تلخی حالات
نثر میں شانِ موج گنگ و جمن
نظم میں لُطفِ شہد و قند و نبات
اُس کو غالب سے جو عقیدت تھی
لب پہ آتا ہے بہر سال وفات
"آہ" کے ساتھ مصرعِ حالیؔ
"سو تکلف اور اس کی سیدھی بات"

۶ + ۱۳۸۶ = ۱۳۹۲ ہجری

تاریخ وفات شمیم کرہانی مرحوم

لُٹ گئی ہے بساطِ بزمِ غزل ۔۔۔ نہ سخن ہے نہ اب سخندانی
ہو گئی دفن ساتھ شاعر کے ۔۔۔ فکر و فن کی بہار سامانی
بن کے تاریخ دل میں ڈوب گیا ۔۔۔ "غم و رنجِ شمیم کرہانی"

۱۹۷۵ء

تاریخ وفات دردناک

رحلت پروفیسر رشید احمد صدیقی

۱۹۷۷ء

دل ظرافت کا سوگوار ہے آج ۔۔۔ طنز کی آنکھ اشکبار ہے آج

اُٹھ گیا ناقدِ حیات و ادب — قلبِ اُردو کا داغ دار ہے آج
گل فشاں تھے جہاں رشید احمد — رُخصت اس باغ سے بہار ہے آج
قدرِ تہذیب ان کے دم سے تھی — روحِ تہذیب بے قرار ہے آج
جس زباں میں وہ بات کرتے تھے — اُس زباں کا جگر فگار ہے آج
دفن ہوتا ہے لُطفِ طنز و مزاح — بذلہ سنجی تہہِ مزار ہے آج
نکتہ دانی کا آج ماتم ہے — ذوقِ تنقید اشکبار ہے آج
کان میں گونجتی ہے اُن کی صدا — دامنِ ہوش تار تار ہے آج
"آہ" کے ساتھ لب پہ ہے تاریخ — "رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج"

۶ + ۱۹۷۱ = ۱۹۷۷

قطعۂ تاریخِ انتقال

۱۹۷۷ء

محسنِ ہند فخر الدین علی احمد صدر جمہوریۂ ہند

۱۹۷۷

فخرِ ہندستاں کا ماتم ہے — ملک کے پاسباں کا ماتم ہے
کارواں ہے غبار کی صورت — رہبرِ کارواں کا ماتم ہے
جس سے تھی آسماں زمینِ وطن — اُسی عظمت نشاں کا ماتم ہے
خاک اُڑاتی ہے ہر روش پہ صبا — باغ میں باغباں کا ماتم ہے
جس طرف دیکھیے اندھیرا ہے — شمعِ بزمِ جہاں کا ماتم ہے
سرِ دہلی ہے شاملِ تاریخ — "فخرِ ہندستاں کا ماتم ہے"

۴ + ۱۹۷۳ = ۱۹۷۷

اس مصرعۂ تاریخ میں 'دہلی' کے سر یعنی پہلے حرف دال کے چار عدد شامل کیے جائیں گے سالِ وفات ۱۹۷۷ء برآمد ہوگا۔

۴+۱۹۷۳ = ۱۹۷۷ فخر الدین علی احمد صاحب کا سالِ وفات ہے۔

رحلتِ جناب محمد طاہر فاروقی

۱۳۹۸ ہجری

اے محسنِ اُردو زباں! اے شمعِ علم، اے دیدہ ور
آئینہ دارِ آگہی، رنگِ رُخِ فکر و نظر
تو، جامعہ کی شکل میں اردو زباں کو دے گیا
حُسنِ فروغِ انجمن، نورِ چراغِ رہ گزر

تیرے بغیر اس بزم میں سب بے سروپا ہو گئے
"حرف و سخن، لطف و عطا، عفو و وفا، نقد و نظر"

ر، خ ط ظ ف ق ط

۲۰۰ ۶۰۰ ۹ ۹ ۸۰ ۸۰ ۱۰۰ ۹۰۰

یہ تاریخ مومن کے انداز میں کہی گئی ہے ان حروف کے عدد جمع کئے جائیں تو ۱۹۷۸ سالِ وفات ہوتا ہے۔

تاریخ وفات

پروفیسر ڈاکٹر یوسف حسن خاں

محرمِ رمزِ حافظ و اقبال — یوسفِ مصرِ فن ہوا رخصت
رحلت ایسے ادیب و ناقد کی — علم کا بانکپن ہوا رخصت

اُٹھ گئی ہے بساطِ اردو سے — آج اک ایسی شمعِ فکر و نظر
دفن ہے جس کے ساتھ ذوقِ جمال — اور نقدِ ادب ہے خاک بسر

جس پہ نازاں رہی ہے صنفِ غزل — ایک عالی دماغ تھا نہ رہا
ہو کے بے "بس" کہا ہے سالِ وفات — "بزم میں اک چراغ تھا نہ رہا"

مصرعۂ تاریخ اپنی جگہ مکمل ہے مگر اس کے اعداد ۲۰۴۱ ہوتے ہیں جب کہ سالِ وفات ۱۹۷۹ء ہے شاعر نے اپنی اس بے بسی کو اس طرح دور کیا کہ لفظِ بس کے ۶۲ عدد مصرعے سے خارج کر دیئے جس کا لطیف اشارہ شعر میں موجود ہے۔

تواریخ سخنداں

ماتمِ مرگِ شیریں کلام

۱۴۰۲ھ

بحرِ علم و دانش جوش ملیح آبادی و فراق گورکھپوری

۱۹۸۲

۱۹۸۲ء میں جوش اور فراق کا انتقال ہوا تھا اس لیے دونوں کی تاریخِ وفات ایک ساتھ ایک ہی مصرعے میں آگئی ہے۔

اُٹھ گئے دنیا سے دونوں باکمال
لُٹ گیا اردو زباں کا طمطراق
ہے دلوں پر نقش تاریخِ وفات
"عزت افزائے سخن جوش و فراق"

۱۹۸۲ء

اُردو زباں کے لب پہ ہے غالبؔ کی یہ فغاں
ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
بزمِ سخن اُداس ہے ویران مے کدہ
اب وہ صدا کا رنگ نہ جوش و خروش ہے
نظم و غزل سنوارنے والے چلے گئے
بزمِ ادب میں اب نہ فراق اور نہ جوش ہے
جو آنکھ شعلہ بار تھی جو لب ترانہ سنج
وہ آنکھ بند ہو گئی وہ لب خموش ہے
لفظ و بیاں کا سحر جگانے جو آئے تھے
اب وہ کہاں ہیں کون کہے کس کو ہوش ہے
از روئے فکر ہے یہی تاریخ عیسوی
"بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے"

۱۹۸۲ = ۱۹۰۲ + ۸۰

تاریخ وفات شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ مرحوم

رہنمائے وطن، مجاہدِ قوم
واصلِ حق ہوا بحکمِ الٰہ
ارضِ کشمیر کا ہر اک ذرہ
اس کے عزمِ بلند کا ہے گواہ
خدمتِ قوم سے ہوا مخدوم
حکمراں تھا بغیر تاج و کلاہ
ذات تاریخ ساز تھی اس کی
دیکھتا تھا زمانہ اس کی نگاہ
اس کے اُٹھتے ہی لُٹ گیا کشمیر
خلدِ آدم کے ہجر میں ہے تباہ
زندگی اس کی اس طرح گزری
جیسے بُرجِ شرف میں پرتوِ ماہ
ایسا انساں کہاں سے لائیں گے
اس کی رحلت ہے صدمۂ جاں کاہ
اس کی تاریخ کس طرح کہیے
داغ دل میں ہے اور لب پر آہ
"بے بہا لعل" کھو کے سال ملا
شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ

۱۵۰
۱۹۸۲ء = ۲۱۳۲ + ۱۵۰

تاریخ وفات سید سجاد ظہیر مرحوم

سیفِ زماں سجاد ظہیر

۱۳۹۳ ہجری

سلام تجھ پہ کہ دار و رسن کی منزل سے
بڑے خلوص بڑے انہماک سے گزرا
ہے تیرے خون سے کشتِ وفا کی سیرابی
ہجومِ برق و بلا مشتِ خاک سے گزرا

جبیں پہ محنتِ پیہم سے بانکپن کی ادا
نظر میں جلوۂ شامِ اودھ کی رعنائی
رفیق فاقہ کشوں کا عوام کا ساتھی
دلوں پہ کی ہے بغیرِ کلاہ، دارائی

قلم کی نوک سے تو نے بہ فیضِ فکر و نظر
کبھی سناں کا کبھی مُو قلم کا کام لیا
نئے اُفق سے نکالے نئے مہ و خورشید
ادب کو حسنِ یقیں، فن کو اعتماد دیا

تو آج ہم میں نہیں، تیری یاد باقی ہے
فضا کو رنگ، چمن کو نکھار دے کے گیا
جنوں نے تیرے کھلائے ہیں آگہی کے چمن
وطن کو اپنے پیامِ بہار دے کے گیا

چمن سے دور، فدائے چمن کو موت آئی
"یہ حادثہ کبھی تہِ شاخ آشیاں نہ ہوا"
ہوئی ہے شاملِ تاریخ تیری "آزادی"
"ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا"

۲۳
۲۳ + ۱۹۵۰ = ۱۹۷۳ء

آخری مصرع فانی بدایونی مرحوم کا ہے۔

تاریخ وفات ساحر لدھیانوی مرحوم

جس کے دم سے تھی فریدی گرمیٔ بزمِ سخن
اب وہ ساحر، مطرب اُردو زباں خاموش ہے
ایک بلبل کے نہ ہونے سے چمن ہے سوگوار
لالہ و گل دم بخود ہیں گلستاں خاموش ہے
اشک بہتے ہیں مگر لب تک فغاں آتی نہیں
شدتِ غم کا یہ عالم ہے زباں خاموش ہے
ہے زمانے کی زباں پر اس کی تاریخ وفات
ساحر لدھیانوی شیریں بیاں خاموش ہے

۱۹۸۰ء

تاریخ وفات آغا حیدر حسن صاحب مرحوم

ہم سے رخصت ہوئے آغا حیدر حسن
جن سے روشن تھی تہذیب کی انجمن
وہ مجسم شرافت، سراپا خلوص
سادگی میں بھی اُن کی تھا اک بانکپن
وہ تھے دہلی کی محفل کے تنہا چراغ
حیدر آباد میں اب ہیں زیرِ کفن
ان کی ذاتِ گرامی تھی ہر رنگ میں
روحِ تہذیب، جانِ ادب، شانِ فن
اب وہ صورت کہاں اب وہ باتیں کہاں
یاد بن کر دلوں میں ہے لطفِ سخن
نام سے ان کے تاریخِ رحلت ملی
آہ "جنّت مقام آغا حیدر حسن"

۱۹۷۶ء

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر قمر رئیس صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کی صدارت میں ایک سمینار ہوا۔ اس سمینار کی تاریخ فارسی کے اس مشہور مصرع سے حاصل ہوئی۔

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم

۱۹۷۶ء

ایک زمانہ تھا جب لوگ میر و غالب کی غزلیں بطور تحفہ دہلی سے باہر لے جاتے تھے آج باذوق حضرات فریدی صاحب کی تاریخیں بطور سوغات لے جاتے ہیں اور اپنے احباب کو سناتے ہیں۔

منظہر احمد

کفرِ تمنّا کا شاعر

مغیث الدین فریدی

آزادی کے بعد اردو شاعری اور شاعری میں بھی خاص کر اردو غزل کی روایت و رجحانات میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ جو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے حوالے سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ اُردو غزل پر ترقی پسند نقادوں کے الزامات جہاں انتہاپسندی کی علامت تھے وہیں ان میں مقصدی ادب اور ماحول کی عکاسی کا جذبہ بھی شامل تھا اور یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند تحریک نے غزل کو ترک کرنے کی کوشش کی بھلا ہو اُن جدید غزل گو شعراء کا جو ترقی پسندوں کی اس انتہاپسندی سے متاثر نہ ہوتے اور کاروانِ غزل کے رہنما کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ساتھ ہی چند بڑے ترقی پسند شاعروں نے اردو غزل کو بناتے سنوارنے اور ترقی پسندانہ خیالات سے مستفیض کرانے میں اہم رول ادا کیا اور یہ مقولہ کہ غزل ماضی کی چیز ہے یا نیم وحشی صنفِ سخن ہے غلط ثابت ہوا۔ غزل کی انفرادیت رمز و ایمار، ایجاز و اختصار اور علامتی اظہار بیان سے اور نکھری۔ آزادی کے بعد جدیدیت کی تحریک نے ایک نئے زاویے سے غزل کو مجروح کیا۔ ابہام و تفہیم کے ناقابل تسخیر قلعے تعمیر کیئے گئے اور ایسا کرتے ہوتے داخلیت کو انتہاپسندی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ غزل تو کیا سارا ادب ہی ابہام اور داخلی و وجودی پیمانوں پر پرکھا جانے لگا یہ سب جہاں مخصوص سماجی و سیاسی ماحول کا نتیجہ تھا وہیں ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں فیشن پرستی اور فارمولا بازی کے زعم کا نتیجہ بھی تھا۔ غزل میں یہ انتہاپسندی یہاں تک بڑھی کہ "ٹیڑھی غزلیں" لکھی جانے لگیں اور قاری نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو وہ شعرائے بھی مقبولیت کی حدوں کو چھوتے رہے جن کا رشتہ روایت، کلاسیکی شاعری اور تغزل سے قائم رہا۔

اردو شاعری کا نیا دور روایت شکنی، فیشن پرستی اور فارمولا بازی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ جدید شعرا نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لیا اور صرف حال کو پیشِ نظر رکھ کر تخلیقات پیش کیں۔ ماضی سے رشتہ ٹوٹنے کے باعث شاعری میں کلاسیکی رچاؤ اور روایت پرستی کا فقدان ہو گیا۔ جدید شعرائے کے نزدیک روایت پرست شعرا قدیم طرزِ احساس سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی شاعری موجودہ شاعری کی ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔ یہ جدید شعرا ادب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور ساتھ ہی زندگی کے مسائل، اس کے نشیب و فراز اور اس کے سرد و گرم کا احساس بھی دلاتے ہیں مگر جو بات ان کے

یہاں کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ان کی شاعری روکھی پھیکی اور بے جان ہوگئی ہے۔ ساتھ ہی شعریت اور تغزل کا خون بھی ہوگیا ہے۔ روایت سے یہ انحراف جدید شعرا کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ مگر ان کے دوش بدوش وہ شعرا بھی ہیں جن کے یہاں روایت پرستی و کلاسیکی شعور نے ان کے فن کو جلا بخشی ہے اور روایت کے گہرے شعور نے ان کے یہاں خاص اہمیت اختیار کرلی ہے۔ ایسے شعرا میں مغیث الدین فریدی کا مقام منفرد ہے جو آزادی کے بعد اردو غزل کی روایت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "کفر تمنا" ہمارے پیش نظر ہے۔

فریدی نے اپنے آپ کو ماضی سے بیگانہ نہیں ہونے دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ماضی سے بیگانہ رہ کر کوئی بھی شاعر ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتا۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ شاعر صرف ماضی کا حصہ بن کر رہ جائے اور اپنے زمانے کے مسائل، موجودہ دور کے ادبی تقاضوں اور جدید موضوعات سے صرفِ نظر کرے بلکہ اچھے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ماضی کے ساتھ رشتہ قائم رکھتے ہوئے حال میں زندگی گزارے نہیں تو وہ کامیابی کی منزلیں طے نہیں کرسکتا۔ روایت یا کلاسیکیت سے کلام میں فنی رچاؤ کے ساتھ تغزل کی خوبصورت آمیزش، اسلوب بیان میں شائستگی اور بے عیبی در آتی ہے۔ فریدی کی غزل میں کلاسیکیت کا گہرا شعور ہے۔ انھوں نے اپنے ماضی سے رشتہ قائم رکھا ہے یہ روایتی شعور ان کے گہرے مطالعہ، وسعتِ نظر اور کلاسیکی سرمائے کی دین ہے۔ کلاسیکیت کی چند مثالیں ۔

دیکھنا ہے مجھے اب عشق کی توفیق طلب
حسن کے ہاتھ میں ساغر بھی ہے تلوار بھی ہے

ہم جن کی توجہ کی خاطر شعلوں میں شگفتہ رہتے ہیں
اللہ کرے دل رکھنے کا ان کو بھی سلیقہ آجائے

جاتی ہی نہیں دل سے تری یاد کی خوشبو
میں دورِ خزاں میں بھی مہکتا ہی رہا ہوں

مندرجہ بالا اشعار جہاں فریدی کے کلاسیکی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں وہیں اس روایت کے پروردہ بھی ہیں جو مخصوص غزلیہ ڈکشن اور مخصوص لفظیات سے متعلق ہیں اور جن کا تعلق روزِ اوّل ہی سے اردو غزل سے رہا ہے۔ یہ الفاظ پرانے اور فرسودہ ہونے کے باوجود بدستور جاندار اور معنی کی تہہ در تہہ سطحیں اپنے دامن میں چھپائے ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج کا غزل گو شاعر بھی انھیں لفظیات کے سہارے معنویت کی نئی راہیں تلاش کرتے میں کامیاب رہتا ہے۔ فریدی نے ان لفظیات، تشبیہات، رموز و کنایات کو اپنا کر انھیں مزید وسعت دی اور استحکام بخشا ہے۔ ساتھ ہی انھیں جدید اسلوب اور جدید حسیت کے پس منظر میں پیش کرکے ان کے کینوس کو وسعت بخشی ہے۔

فریدی کی غزلیہ شاعری میں عشق حقیقت اور مجاز دونوں صورتوں میں ابھرا ہے ساتھ ہی انہوں نے جہاں عشق کی عظمت سے اپنی شخصیت کے خدّ و خال کو سنوارا اور بنایا ہے وہیں حق کو پانے کی کوشش بھی کی ہے۔ عشق کا یہ رشتہ جہاں محبوب کی خوبصورتی سے وابستہ ہے وہیں خدا کا جلوہ دیکھنے کا تمنائی بھی ہے۔ ان کے عشق کے یہ دونوں سرے (حقیقت اور مجاز) ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہوگئے ہیں کہ انھیں الگ کرنا دشوار ہے اور اس کا تعلق بھی اس روایت اور مخصوص لفظیات سے ہے جو حقیقی و مجازی عشق کو بیک وقت شعر کا جامہ پہنانے میں کامیاب ہوا

ہے۔ ان کی غزلیں وارداتِ عشق کی تمام تر کیفیات اور حالات کے بھرپور مرقعے ہیں۔ یہ عشق جو خالص ارضی ہے ان کی غزلوں میں واضح رجحان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ محبوب کی نازک بدنی ہو یا گل پیرہنی۔ زلفِ محبوب کے بدلتے ہوتے انداز ہوں چاہے شوقِ طلب اور ذوقِ فغاں ہو۔ نظروں کا تصادم ہو یا محبوب کی یاد کی مہک۔ ہر موقع اور ہر جذبے کو انہوں نے اپنے دل کی دھڑکن بنا کر پیش کر دیا ہے۔ یہ مضامین جو بہت پرانے ہیں اور بار بار استعمال کئے جا چکے ہیں۔ فریدی کے یہاں ان کے مخصوص اندازِ بیان اور ندرتِ جذبات کے ساتھ پیوست ہو کر ایک نئی شان سے ابھرے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

پھولوں میں جھلکتے ہیں چہرے، شاخوں پہ گماں آغوش کا ہے
کچھ ایسی بسی ہے نظروں میں گل پیرہنی، نازک بدنی

اے شوقِ طلب، اے ذوقِ فغاں، اے ہمت غم، توفیق جنوں
وہ آنکھ ابھی پرنم بھی نہیں وہ زلف ابھی برہم بھی نہیں

دل کی لبتی سے جو گزرا تری یادوں کا ہجوم
خاک اڑاتے ہوتے سب کوچہ و بازار ملے

شبِ انتظار کے بعد پھر نہ ہوئی طلوع کوئی سحر
مری عمر ساری گزر گئی یہی ایک رات لیے ہوتے

فریدی کا عشق ایک خوددار انسان کا عشق ہے۔ وہ عشق میں سراپا نیاز ہو جانے کو عشق کی توہین سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نازک سے نازک مرحلہ پر بھی وہ اپنی شخصیت اور خودشناسی کو نہیں بھولے ہیں۔ انھیں اپنی شخصیت، اس کی اہمیت اور انا کا پورا احساس ہے اور یہ احساس عشق کے میدان میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ محبوب کے سامنے سراپا انکسار اور خود فریبی کی کیفیت سے وہ کبھی نہیں گزرتے بلکہ اپنی شخصیت کو منوانے کی چاہت ان کے کلام میں ملتی ہے جہاں وہ عشق کے جذبے اور اس کی صداقت تک پہنچ جاتے ہیں۔ فریدی کا عشق سچّا ہے اور یہی وجہ ہے کہ محبوب کے خلوص کی کمی کو بے وفائی کا سبب بتانے میں وہ ہچکچاتے نہیں ہیں ؎

تیرے خلوص میں ضرور کوئی کمی کہیں تو تھی
مجھ سے وفا نہ ہو سکی، عزمِ وفا کے بعد بھی

ساتھ ہی خودشناسی سے متعلق کہتے ہیں ؎

مرے دل کے ساتھ ہی چھین لے مری خودشناس نگاہ بھی
میں ترے قریب نہ آؤں گا یہ توہمات لئے ہوتے

مگر اس سب کے باوجود بھی وہ تمنّا کے ہاتھوں مجبور ہیں جو ان کے دل میں عشق کی چنگاری بھڑکاتی رہتی ہے۔ فریدی کے نزدیک ان کی تمنّائیں اور آرزوئیں ہی انھیں زندگی کو گوارا بنانے کا درس دیتی ہیں۔ وہ محبّت کی تمنّا کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کے دل میں صرف محبت کی تمنّا کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہی تمنّا انھیں اکساتی ہے کہ وہ اپنے محبوب سے محبّت کریں۔ اسی تمنّا کے لئے وہ جیتے ہیں اور اسی کے لئے مرتے ہیں۔ محبّت سے زیادہ جذبۂ محبّت کی صداقت نے ان کی

شخصیت اور شاعری دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ خود اپنی تمنّا کے اسیر ہیں ؎

مجھے اسیر کیا ہے مری تمنّا نے
نہ تیری بات میں افسوں نہ آنکھ میں جادو

فریدی کے عشقیہ اشعار کا ایک سرا ان کے متصوّفانہ کلام سے جا ملتا ہے۔ فریدی ایک خاص ماحول و خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں صوفی اِزم اور تصوّف و صلح کل کی تعلیم کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ بچپن ہی سے یہ ماحول ملنے کی وجہ سے ان کا ذہن تیزی سے اس طرف راغب ہوا۔ فریدی کے مزاج کی بے نیازی، انکسار اور اخلاص و خلوص اس بات کی دلیل ہیں۔ انھوں نے متصوّفانہ خیالات کو اپنی غزل میں سمو کر ایک کھوئی ہوئی روایت کو دوبارہ جنم دینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ موجودہ غزل میں تصوّف و صلح کل کے مضامین برائے نام رہ گئے ہیں۔ مگر فریدی کے یہاں یہ غالب رجحان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی روایت کے شعور کی باعث ان اشعار میں شائستگی اور اسلوب میں سادگی بھی ہے۔ ان کے متصوّفانہ اشعار گہرے جذبے و خلوص کا مرقع ہیں اور انہوں نے ایسے اشعار میں غزل کی مروّجہ علامتوں کو برتا ہے۔ ساتھ ہی تصوّف کی عمارت کو دوبارہ بلند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا تصوّف غالب کی طرح برائے شاعری نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کا ایک جزو ہے ؎

کبھی تجھ پہ اپنا گمان ہے کبھی خود پہ تیرا گمان ہے
مرے کردگار کہاں رہوں یہ تصورات لئے ہوئے

پاس ہے تیری مشیت کا یہ اندازِ طلب ورنہ میرے لئے اسباب جہاں کچھ بھی نہیں

ان کے کلام میں بے ثباتیٔ دنیا، اخلاقی مضامین اور عاجزی و انکسار کا ماحول، تصوف کی دین ہے اور یہ مضامین ان کی شخصیت کی عظمت کا ثبوت بن گئے ہیں۔ بے ثباتیٔ دنیا سے زندگی کی حقیقت اور اس کی سچائیوں پر ان کی گہری نظر ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ایک معیارِ زندگی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جو خاص ان کی خاندانی وراثت اور شخصیت کی دین ہے۔ فریدی کو بے ثباتیٔ دنیا کا احساس ہر پل رہتا ہے۔ وہ اس جہانِ فانی سے دل لگانے کا سبق نہیں دیتے بلکہ اس کے فانی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ زندگی کو ایسے کلام سے تشبیہ دینا جو لبوں تک آتے ہی تابِ گویائی چھین لے۔ اچھوتا خیال ہے جو فریدی کے اس شعر میں نہاں ہے۔ ساتھ ہی بے ثباتیٔ دنیا کا خیال بھی پیشِ نظر رہتا ہے ؎

یہ زندگی ہے کہ جیسے کوئی ادھوری بات لبوں تک آتے تو چھن جائے تابِ گویائی

بے نیازی، توکّل، فقر و استغنا، انکسار، قلندرانہ شان سبھی تصوّف کی دین ہیں۔ ان کا دل ہمیشہ بے نیازِ طلب رہا ہے لہٰذا نارسائی کا طعنہ انہیں زیب نہیں دیتا ؎

فریدی کا دل بے نیازِ طلب ہے اسے طعنۂ نارسائی نہ دیجیے
کسی اور نشتر سے اب وار کیجیے، یہ خنجر مرا آزمایا ہوا ہے

طبعِ فریدی کو کوئی شکوہ زمانے سے نہیں دنیا میں وہ رہتا بھی ہے، دنیا سے بے پروا بھی ہے

لیکن شاعر کا یہ مزاج موجودہ زندگی کے موافق نہیں ہے۔ یہ زندگی تو مکرو فریب، مصلحت پسندی اور خود غرضی سے عبارت ہے۔ یہاں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جس میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مکرو فریب کے بغیر اکثر ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے۔ سارے اصول اور آدرش رائیگاں جاتے ہیں اور زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جاتی ہے۔ مگر فریدی کے قدم ڈگمگاتے نہیں ہیں۔ انہوں نے ان اصول و نظریات پر سختی سے قدم جماتے رکھے ہیں۔ جن کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا۔ انھیں اپنی راہ کی سچائی اور اصولوں پر پورا یقین ہے۔ پے بہ پے ناکامیوں سے وہ ہمت نہیں ہارے ہیں بلکہ انھیں امید ہے کہ دنیا ایک نہ ایک دن ان کے سانچے میں ڈھل جائے گی ؎

ہمیں یہ طعنے نہ دو کہ ہم نے زمانہ سازی کے گر نہ سیکھے
کہ رفتہ رفتہ مزاجِ دنیا ہمارے سانچے میں ڈھل رہا ہے

ساتھ ہی انھیں عظمتِ انسان کا پورا اعتراف ہے۔ یہ بھی تصوّف کی دین ہے۔ جہاں انسان خدا کا نائب بن کر سامنے آیا ہے ساتھ ہی اشرف المخلوقات کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انہوں نے انسانی رتبہ کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ مٹی سے بنا یہ انسان جب عظمتوں کی طرف گامزن ہوتا ہے تو فرشتوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں انہوں نے معراج کے واقعہ کی مدد سے عظمتِ انسان کو ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ؎

جس راہ میں جبریل کے پر کانپ گئے تھے   اس راہ میں نقشِ کفِ پا ہم نے بنایا

اس شعر کو پڑھ کر خواجہ میر درد کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے ؎

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے   وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

فریدی کی غزلوں کا ایک وصف نشاطیہ غم کی وہ لے ہے جو انھیں زندگی گزارنے اور خوشگوار بنانے میں معاون ثابت ہوئی ہے ساتھ ہی اس سے ان کے توکل اور غموں سے خوشیاں چُن لینے کی صلاحیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اسی نشاطیہ آہنگ سے انہوں نے زیست کی سختیوں کو گوارا بنا لیا ہے۔ یہ غم اس غم سے عبارت نہیں ہے جو زندگی کو منفی میلانات کی طرف لے جاتا ہے اور جس سے گہری قنوطیت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ یہ غم وہ دولت ہے جس سے انھیں اور ان کی شاعری کو بڑے جذباتی سہارے ملے ہیں۔ ساتھ ہی گردشِ دوراں کی تلخیوں کو گوارا بنانے کا فن بھی اسی نشاطیہ غم کی لے سے عبارت ہے جو خود فریدی کے نزدیک ؎

حاصلِ فن ہیں فریدی وہی اشعارِ غزل   خونِ دل جن میں ہو رنگینیٔ افکار کے ساتھ

فریدی کے نزدیک شاعری صرف فکر کی بلندی کا نام نہیں ہے کہ کوئی اچھوتی یا انوکھی بات کہہ دی جائے بلکہ ان کا فن خونِ جگر کو شعر کی روح میں داخل کرنے سے عبارت ہے جہاں شاعر کا ایک شعر ایک واردات ہوتے ہوئے اپنے اندر جذبۂ خلوص کی پوری کائنات رکھتا ہے کہ شعر شاعر کے تجربے سے ہو کر گزرا ہے اور شعر کو جلا بخشنے کے لئے اس نے اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے کام لیا ہے۔ فریدی کے نزدیک اس جذبے سے ہٹ کر شاعری صرف قافیہ پیمائی بن کر رہ جاتی ہے۔ شعر کے لئے اولین شرط جذبہ ہے۔ فریدی تجربے کو اوّلین اہمیت دیتے ہیں۔ جن سے ان کی وسعتِ نظر

اور فکر و گیرائی کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی خونِ جگر کی آمیزش سے ان کے اشعار میں شعریت اور تغزل قائم رہتا ہے۔ ان کے کلام پر غم و افسردگی کی چادر سی پڑی ہوئی ہے۔ جس سے زندگی، اس کے دکھ درد، مصائب و تکالیف کی دھیمی دھیمی آنچ آرہی ہے۔ فریدی کے یہ اشعار غم و افسردگی کو جذبہ و فکر سے ہم آہنگ کرکے سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔ ان میں خلوص و شائستگی اور سوز و گداز کی ملی جلی کیفیت ہے۔ غم و الم کا ماحول ہے ؎

اب دیکھئے کس رنگ میں یہ شام ڈھلے گی کچھ گردشِ حالات کی لے تیز بہت ہے
غمِ دوراں کی ہر بندش مزہ دینے لگی دل کو تری زلفوں کے خم پہ زندگی کیونکر اٹھا لائی

فریدی کے یہاں یہ نشاطیہ غم بڑی بحر کی غزلوں میں طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ ان غزلوں میں بحروں کے مترنم ہونے کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی آمیزش سے جو آہنگ ابھرا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دوسری خوبی ان غزلوں کی یہ ہے کہ دو مصرعوں میں جذبہ و خیال پوری رعنائی اور سیاق و سباق کے ساتھ یوں ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ یہ ان غزلوں کو کسی بھی اچھے انتخاب میں جگہ دینے میں معاون ہوتے ہیں ؎

ہم وہی، غم وہی، پھر یہ کیا ہو گیا ہم خود اپنے لئے اجنبی بن گئے
گردشِ وقت سے دِل مگر جھوم اٹھا کچھ تو بدلا وہ رنگ جہاں ہی سہی

ہم ہی مارے گئے ہم ہی رسوا ہوئے تیرے دامن پہ کوئی بھی دھبہ نہیں
جم گئی ہے مگر دامنِ وقت پر یہ وفا دشمنی بھی لہو کی طرح

فریدی کی غزلوں کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان غزلوں سے ان کی زندگی، ان کی شخصیت اور اخلاق و اقدار نیز کردار کی آئینہ داری بدرجۂ اتم ہوگئی ہے۔ جو فنی صداقت کی طرف دلالت کرتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ فریدی نے جو کچھ ان پر گزر رہی ہے اس کو رقم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ساتھ ہی شخصیت کے رموز کا بیان بھی بالواسطہ طور پر کر دیا ہے۔ جس کا تعلق غیر شعوری کوشش سے ہے۔ ان غزلوں کے مطالعہ سے ہم ان کی شخصیت و کردار کا ایک خاکہ بآسانی مرتب کر سکتے ہیں اور جو لوگ فریدی صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ ہمارے اس بیان کی تائید کریں گے۔ انہوں نے اپنے ظاہر و باطن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہونے دیا ہے اور اس کو بیان کرتے میں وہ کبھی ہچکچائے نہیں ہیں۔ ایک سچے فنکار کی پہچان بھی یہی ہے۔ کوئی بھی فنکار اپنی شخصیت اور اپنی زندگی کو نظرانداز کرکے تخلیقات پیش نہیں کر سکتا۔ لہذا کچھ نہ کچھ اثر اس کی شاعری پر ان خارجی اثرات کا ضرور مرتب ہوتا ہے۔ اچھے فنکار کی پہچان دراصل اس کی تخلیق ہوتی ہے۔

ہر شاعر کا اپنا ایک منفرد اندازِ بیان ہوتا ہے جو اس کی پہچان بنتا ہے۔ اسی طرح ہر شاعر کے یہاں کچھ مخصوص الفاظ و تشبیہات ہوتے ہیں جنہیں وہ بار بار استعمال کرتا ہے۔ بالآخر وہ لفظیات اس شاعر کی پہچان بن جاتے ہیں۔ مثلاً لفظ "صبا" یوں ایک عام لفظ ہے مگر فیض کی شاعری

میں اس نے ایک انفرادیت حاصل کر لی ہے۔ لہٰذا آج یہ لفظ فیض سے منسوب ہو کر رہ گیا ہے۔ فریدی کی شاعری میں بھی کچھ الفاظ ایسے ہیں جو بار بار استعمال ہوتے ہیں اور معنی کی تہہ در تہہ سطحیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان الفاظ میں "جنون و خرد" کی اہمیت خاص ہے۔ جنون و خرد کے الفاظ کو انہوں نے مختلف کیفیات و تاثرات کے ساتھ بار بار اپنی غزلیہ شاعری میں برتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ "کفر تمنا" میں یہ الفاظ شاعر و شاعری کی افہام و تفہیم میں اہم رول ادا کرتے ہیں جنون و خرد کا سلسلہ جہاں ایک طرف راہِ عشق کی پیچیدگیوں سے جا ملتا ہے وہیں تصوّف کی اصطلاحات کے ذریعہ متصوّفانہ بیانات سے منسوب ہو جاتا ہے۔ فریدی کے نزدیک جنون کی حیثیت خرد سے زیادہ ہے۔ وہ عشق کے لئے جنون کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جنون کے ذریعہ ہی انسان عشق کی منزل تک پہنچتا ہے جبکہ خرد انسان کو گمراہ کرتی اور بہکاتی ہے اور پھر خرد وہ راستہ ہی نہیں ہے جس پر چل کر منزلِ مراد حاصل کی جائے۔ جنون کا راستہ بظاہر بڑا پُر خطر ہے مگر کامیابی سے ہمکنار ہونے کے امکانات بھی روشن ہیں۔ لہٰذا فریدی نے خرد پر جنون کو ترجیح دی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ جنون ان کے لئے زیست کا ذریعہ بھی بنا ہے ؎

مزہ تو یہ ہے جنوں سے ہے آگہی کا بھرم
بہک نہ جاتے تو سب راز کہہ دیئے ہوتے

کسی میں ہمت نہ تھی کہ بڑھ کر جنوں کی زنجیر تھام لیتا
خرد کی بستی میں ہے اندھیرا چراغ صحرا میں جل رہا ہے

مندرجہ بالا بیانات سے جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ فریدی قدامت پرست شاعر ہیں۔ زمانے کے حالات جدید موضوعات اور نئی حسّیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ جہاں فریدی کی غزل روایت و کلاسیکی پختگی کا پتہ دیتی ہے وہیں جدید موضوعات و احساسات کی ترجمانی بھی بڑی عمدگی سے کرتی ہے۔ فریدی زمانے کے ہاتھوں بنتے بگڑتے ہیں پھر کیسے اس سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز اس کے کھرے کھوٹے اور اچھے برے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اور انہیں اپنے اشعار میں شامل کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے روایتی شعور اور کلاسیکی رجحان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان جدید موضوعات کے لئے انھیں تشبیہہ و استعارات کا استعمال کرتے ہیں جو غزل سے منسوب ہو گئے ہیں۔ رمز و کنایہ کی شان نے ایسے اشعار میں یہ الفاظ معنوی گہرائی کی بدولت علامتوں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کی نظر زندگی کے مسائل، اس کی پیچیدگیوں اور اس کی خامیوں پر گہری پڑی ہے۔ لہٰذا اس کا اظہار بھی بڑا دردمندانہ اور فکر انگیز ہے ؎

اس دور میں انسان کا چہرہ نہیں ملتا
کب سے میں نقابوں کی تہیں کھول رہا ہوں

ہم اپنا سر کہاں جا کر چھپاتیں
چھتیں ٹوٹی ہوئی ہیں سب گھروں کی

نہ فکرِ ستم ہے، نہ شکرِ کرم ہے نہ دل میں تڑپ ہے نہ ہے آنکھ پر نم
نہ ذوقِ طرب ہے نہ شوقِ الم ہے نہ جانے محبت کو کیا ہو گیا ہے

اک بار اپنے آپ سے ملنے کی حسرت ہے مجھے
ہستی مری اس شہر میں کھوئی ہوئی آواز ہے

رنگ جہاں کا عکس ہے ایک ایک چہرے پر یہاں　　جو اپنے دل کا عکس ہو ایسا کوئی چہرہ بھی ہے

غرض ان کی یہ غزلیں قدیم وجدید روایت کا بہترین امتزاج ہیں۔ یہاں وہ روایتی شعور بھی ہے جس کا ذکر ہم نے ابتدائی سطور میں کیا اور وہ جدید اسلوب بھی جو زندگی کے نشیب و فراز اور زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ سے عبارت ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان اشعار میں روایتی تازگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے قدیم وجدید کی خوبصورت آمیزش سے اپنے فن کو نکھارا ہے ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے اپنے حال میں سانس لی ہے اور زندگی کے سرد و گرم سے اپنے فن کو آراستہ کیا ہے۔ یہاں زندگی کے پیچ و خم نہ صرف بیان ہوتے ہیں بلکہ نہایت عمدگی اور فکر و فن کی گہرائیوں سے گزر رہے اور سنور رہے ہیں۔ اپنا یہ ناقص مضمون میں فریدی صاحب کے اس شعر کے ساتھ ختم کرتا ہوں جو ان کی زندگی اور شاعری کی تقریباً عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

بستی میں بسیرے کا ارادہ تو نہیں تھا
دیوانہ ہوں صحرا کا پتہ بھول گیا ہوں

⁂

سراج اجملی

فریدی صاحب کی تضمینیں

فریدی صاحب نے غزلوں کے علاوہ تضمین نگاری میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ تضمین نگاری ایک مشکل فن ہے کیوں کہ اس میں تضمین نگار شاعر کی ذہنی سطح تک پہنچ کر اس کے مصرعوں پر اپنے مصرع اس طرح لگاتا ہے کہ پیوند کاری کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اکثر شعرا نے خود اپنی غزلوں پر تضمین کی ہے۔ فریدی صاحب نے "کفر تمنا" میں جو تضمینیں شائع کی ہیں ان میں بیشتر اساتذہ کی غزلوں کی تضمین ہے۔ تضمین کی روایت ہماری شاعری میں خاصی قدیم ہے اکثر اردو شعرا نے فارسی کے مشہور غزلوں پر مصرع لگا کر ان کے لطف کو دو آتشہ کر دیا ہے، نعت و منقبت کی شاعری میں بھی تضمین کا ایک خاص لطف دیکھا جاسکتا ہے۔ فارسی کی مشہور غزلوں میں سے شاید کم ہی ایسی ہیں جن پر ہمارے کسی نہ کسی شاعر نے خوبصورت تضمین نہ کی ہو۔ فریدی صاحب نے بھی یہ کارنامہ انجام دیا ہے لیکن ہمارے پیش نظر جو مجموعہ ہے۔ اس میں ان کا یہ فن اُردو شاعری کی نمونوں تک ہی محدود ہے۔ میر، غالب، فانی، فیض اور خورشید الاسلام کی غزلوں پر خوبصورت تضمین کے نمونے قاری کی ضیافت طبع کے لیے فریدی صاحب نے اپنے مجموعے میں پیش کیے ہیں۔ فریدی صاحب کی تضمین نگاری کے تعلق سے کوئی ماہرانہ رائے تو اساتذہ ہی دے سکتے ہیں ایک طالب علم کی حیثیت سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں جو شعرا تضمین کے فن کا بخوبی مظاہرہ کر رہے ہیں ان میں فریدی صاحب کی تضمینیں ایک نمایاں مقام کی حامل ہیں اس بات سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو۔ اپنے اس معروضے کی سند کے بطور میں ایک انتخاب پیش کرتا ہوں۔

میر کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

اس شعر پر فریدی صاحب کی تضمین ملاحظہ ہو ؎

سجتی ہے قبا درد و اثر کی مرے تن پر
تا حشر جہاں ناز کرے گا مرے تن پر
میں ابر بہاری ہوں تغزل کے چمن پر
جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

غالب کی غزل ؎ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی پر فریدی صاحب نے اپنے اس فن کو بہت خوب طریقے سے استعمال کیا ہے اور تضمین کے کچھ لاجواب بند پیش کیے ہیں آپ بھی دیکھیں ؎

پژمردہ تھی فضائے محبت نکھر گئی
تقدیر عشق ایک نظر میں سنور گئی
اک سوز بے پناہ رگ و پے میں بھر گئی
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

بے پردگی سے کام لیا ہے حجاب کا
راس آگیا ہے حسن کو نشہ شباب کا
ساغر چھلک گیا نگہ کامیاب کا
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

ہر سر میں ہے ہوائے محبت بھری ہوئی
پہلے تو اتنی عام یہ جنس گراں نہ تھی
موتی کی آب سیپ کے ٹکڑوں نے لوٹ لی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

فانی کی غزل ؎ مژدۂ عیش یہ تمہید پریشانی ہے ۔ کے چھے اشعار پر فریدی صاحب نے تضمین کی ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ اگر یہ تضمین فانی کے دیوان میں شامل کر دی جائے تو اسے فانی کا کلام سمجھنے میں کسی کو قباحت نہ ہو۔ یہی دراصل تضمین نگاری کا کمال ہے۔ ملاحظہ ہو ایک مثال ؎

شعلۂ آتش الفت میں جلا کر گھر بار
فکر دنیا غم عقبیٰ سے ہوا ہوں بیزار

اب مجھے خوف خزاں ہے نہ تمنائے بہار
دونوں عالم ہیں ترے سوختہ ساماں پہ نثار
چشم بد دور عجب بے سروسامانی ہے

اور آخر میں فیض کی دو غزلوں پر فریدی صاحب کی تضمین کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فیض کی غزل پر جس کا مطلع ہے ؎

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

اس غزل کی تضمین ایسی ہے کہ اگر فریدی صاحب کے ہی لفظیات مستعاروں تو عرض کر سکتا ہوں کہ مثل نگینے کے مصرعے جڑے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

اپنی آہوں سے بجھائے ہیں اُمیدوں کے چراغ
بے طلب جب بھی ملا توڑ دیا ہم نے ایاغ
غیرتِ عشق کا دامن ہے ابھی تک بے داغ
کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

صبح ہر حال میں ہوگی مگر اتنا تو کرو
مجھ کو جی بھر کے سرور شب غم لینے دو
میری خاطر سے ذرا ڈوبتے تارو ٹھہرو
اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

پر تو جام سے ہر سمت چراغاں کردو
خیر مقدم کے لیے تا در مے خانہ بڑھو
عظمت مشرب رندانہ دکھادو ان کو
رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے مے خانہ سفیران حرم آتے ہیں

فیض کی دوسری غزل ''یاد غزال چشماں ذکر سمن عذاراں'' پر فریدی صاحب کی تضمین ملاحظہ ہو

زنداں میں بھی نہ بدلا انداز مے گساراں
بے بادہ کیف و مستی، بے فصل ابرو باراں
مجبور غم نہیں ہے عیش جگر فگاراں

یاد غزال چشماں ذکر سمن عذاراں
جب چاہے کر لیا ہے کنج قفس بہاراں

آغاز شب سے دل میں یہ سوز صبح گاہی
نور دل و نظر ہے یہ ہجر کی سیاہی
مسجود کامرانی ہونے لگی تباہی
آنکھوں میں دردمندی ہونٹوں پہ عذرخواہی
جانانہ وار آئی شام فراق یاراں

اور مقطع کی تضمین بھی دیکھیں ــــ

ہوتی ہے رفتہ رفتہ راہ جنوں منور
جھومے گی روح مستی مہکے گا قلب مضطر
بوئے وفا سے ہوگا ہر ہر نفس معطر
آئے گی فیض اک دن یاد بہار لے کر
تسلیم مے فروشاں پیغام مے گساراں

محمد نفیس حسن

کفرِ تمنّا کی روشنی میں

فضا ہے گوش بر آواز چپ ہیں اہل نوا
اب اس ادھوری کہانی کو ہم تمام کریں

اردو شاعری دراصل غزل کی شاعری ہے، انسانوں اور قوموں کی نفسیات کی طرح زبان و ادب کی بھی نفسیات ہوتی ہے اردو زبان و ادب کی جملہ اصناف میں غزل کی نفسیات اس کی داخلیت، جمالیاتی کیف اور عام انسانی احساسات و تجربات کی دلکش مرقع کشی ہے۔ روایت کے اعتبار سے غزل کا لہجہ ہمیشہ نرم و نازک اور لطیف جذبات کا آئینہ دار رہا ہے اور تغزل اس کی بنیادی خصوصیت۔ لہذا غزل کی تاریخ میں جب بھی اس حقیقت سے انحراف کیا گیا تو وہ طرزِ سخن بہت جلد فراموش کر دیا گیا اور کسی طرح پسندیدہ ثابت نہیں ہوا۔

ہر دور میں شعرا کی کثیر تعداد ضرور رہی ہے لیکن شہرتِ عام اور بقائے دوام کا سہرا انھیں کے سر بندھا جن کے کلام میں رنگینیٔ افکار کے ساتھ خونِ دل بھی شامل تھا۔ چنانچہ غزل اپنے ارتقائی سفر میں میر، درد، مومن، غالب، حسرت، فانی، جگر، اصغر اور بالخصوص اقبال جیسے عظیم المرتبت شعرا کی رہینِ منت رہی ہے۔ میر سے غالب تک، غالب سے حسرت تک اور پھر فراق و فیض تک غزل نے حسن و رعنائی کے ساتھ مختلف پیرہن بدلے۔ فریدی صاحب کا رنگِ تغزل اردو غزل کے مختلف النوع اور منفرد اسلوب و طرزِ بیان کے چار شعرا میر، غالب، فانی اور اقبال کے اکتسابِ فیض کا رہینِ منت ہے "کفرِ تمنا" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایوانِ فریدی میں یہ چار ستون خاص طور پر نمایاں ہیں۔ فریدی صاحب کی زندگی کا چالیس سال سے بھی زائد حصہ ان کی غزل گوئی کی طویل اور مسلسل تاریخ ہے بلکہ فنِ غزل اور اس کے ارتقائی سفر میں رونما تبدیلیوں کا سراغ بھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ فریدی صاحب کی زندگی غزل کے آتش رفتہ کا سراغ ہے اور غزل ان کی زندگی اور شخصیت کی ترجمان۔

فریدی صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں اپنے خاندانی اثرات (جس کا سلسلہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے ملتا ہے) ارضِ تاج کو دلفریبی و رعنائی، سینٹ جانس کالج (آگرہ) کی منضبط اور علمی فضا، پروفیسر حامد حسن قادری کی متواضع و علمی شخصیت کی تعلیم و تربیت، علی گڑھ کی رواداری اور رشید احمد صدیقی سے

والہانہ وابستگی و شیفتگی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ کفرِ تمنّا کا انتساب فریدی صاحب نے جن اساتذہ کرام کے ساتھ کیا ہے ان میں مذکورہ دو حضرات سر فہرست ہیں۔ اسی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں آپ نے درس و تدریس کی راہ اختیار کی۔ ۱۷ سال سینٹ جانس کالج میں اور پھر ۱۹۶۲ء سے اب تک دہلی یونیورسٹی کے "شعبۂ اردو" میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک کامیاب اور مثالی استاذ ہیں۔ ان کی جتنی زندگی شعر گوئی میں گزری تقریباً اتنی ہی درس و تدریس میں۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن شاعری کو ذریعۂ عزّت سمجھا وسیلۂ دولت اور شہرت نہیں بنایا۔

غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے انھوں نے اردو شاعری کی آبرو کو نہ صرف باقی رکھنے بلکہ افزوں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا دل ہمیشہ فدائے رنگِ غزل رہا ہے ؎

ہزار شیوے تھے گفتگو کے ہزار انداز تھے سخن کے
مگر بہ ایمائے دل فریدی فدائے رنگِ غزل رہا ہے

ان کی بیشتر غزلوں کے اشعار غزل کی تعریف و خصوصیات کے ترجمان ہیں اور غزل سے یہ فطری مناسبت ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت بن جاتی ہے مثلاً ع

شعلہ احساس کا پیکر حرف میں ڈھل کے نکھرے کسی شعلہ رُ کی طرح

مجموعۂ کلام کا عنوان "کفرِ تمنّا" پہلی نظر میں ذہن کو چونکا دینے والا ہے۔ یہ دراصل بقول ڈاکٹر شریف صاحب 'اعترافِ ایمان' ہے اور ناچیز کے نزدیک 'اعترافِ استغنا'۔ فریدی صاحب کی زندگی صلحِ کل، استغنا اور بے نیازی کا نمونہ ہے اور مجموعہ کے عنوان کا یہ انتخاب بھی غیر شعوری طور پر ان کی شخصیت کا ترجمان ہے۔ فریدی صاحب کی شخصیت جس علمی و تہذیبی فضا کی آئینہ دار ہے وہی فضا ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے جس سے ان کی پاکیزگیٔ ذوق، لطافتِ طبع اور شدّتِ احساس کا بھی اندازہ ہوتا ہے نیز مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے سبب کلامِ فریدی میں روانی، ہمواری، برجستگی اور شائستگی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔

فریدی صاحب غالب سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ غالب کے بعد وہ اقبال کے فکر و فن دونوں کے قائل ہیں۔ جدید غزل میں وہ حسرت سے زیادہ فانی سے متاثر ہیں۔ فانی کا رنگ کفرِ تمنّا میں جا بجا جھلکتا ہے۔ فانی کی دقت پسندی اور فکری گہرائی غالب کی یاد دلاتی ہے۔ معیاری زبان اور پاکیزہ اظہارِ خیال کے ساتھ فانی نے غم کے تصوّرات کو اپنے منفرد رنگ میں پیش کیا ہے فریدی صاحب بھی فانی کی اس ادا سے متاثر ہیں اور اسے اپنے کلام میں برتنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ اگرچہ فانی کی طرح حزن و یاس ان کے یہاں نہیں لیکن جبر حالات کے بعض اثرات انھیں فانی کے عرفانِ غم کے قریب کر دیتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز اور بعض اہم حالات نے انھیں بہت زیادہ حساس بنا دیا لیکن طبیعت کی زندہ دلی اور حُسنِ قبول نے انھیں غمزدہ نہیں کیا۔ ان کے یہاں درد کی ہر تڑپ متاعِ گراں ہے۔ ہر قدم پر نئے امتحان سے دوچار ہونے کے باوجود گھبراہٹ نہیں بلکہ ہر تیز و تند ہوا کو وضع داری کے ساتھ جھیلنے کا عزم ہے اب یہ بات الگ ہے کہ رونق و شورشِ انجمن کے بدلے تنہا نشینی کے خریدار ہوئے لیکن زندگی کے ہر وار کو ہنس کر سہا اور "جبیں پر شکن ہے نہ ماتھے

پہ دھبّہ"، انھوں نے "سنگِ ملامت" کا جواب بھی آئینہ سے دیا ہے۔ اگرچہ زمانہ سازی کا گر نہیں سیکھا لیکن کبھی تو زمانے کے مزاج کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے تو کبھی اپنی سخت جانی سے خنجروں کی دھاریں موڑ دی ہیں۔ "کفرِ تمنّا" کے بیشتر اشعار غم کی ان مخصوص کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں، اگرچہ شدّتِ جذبات میں کہیں دامانِ امید چاک ہوتا نظر آتا ہے اور غم کو اپنانے اور گلے لگانے کا جذبہ اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ شاعر دشتِ وحشت میں اپنے ہاتھ سے کانٹے چبھونے پر آمادہ ہے ؎

کرم نہ خار کا ہوتا تو دشتِ وحشت میں
خود اپنے ہاتھ سے کانٹے چبھو لئے ہوتے

یا بزمِ طرب کی شعلہ بدامانی اور جشنِ فصلِ بہاراں کی عدم موجودگی کے سبب زندگی سے بیزاری ہے اور بزمِ جہاں سے منہ پھیر کر شہرِ نگاراں کو خیرباد کہتا ہے ؎

بزمِ طرب ہے شعلہ بداماں ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے
ختم ہے جشنِ فصلِ بہاراں ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے
دیکھ کے ہم نے بزمِ جہاں کو پھیر لیا منہ بزمِ جہاں سے
تجھ کو سلام اے شہرِ نگاراں ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے

لیکن یہ جذبات بھی فطری ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور کشاکش میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جو انسان کو شدید جذبات کے اظہار پر مجبور کر دیتے ہیں اگر یہ ذہن میں مستقل سرایت کر جائیں تو انسان پھر کسی طرح مطمئن اور قانع نہیں ہو پاتا۔ اس کے برخلاف اگر یہ کیفیت وقتی ہو اور ذہن پر حاوی نہ ہو تو پھر انسان میں مقابلہ کرنے کا حوصلہ بڑھتا ہے اور یہ جذبات کسی "تازہ شاخِ چمن" کی طرح آندھی میں لچک جانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور یہی ہے وہ مزاج جو فریدی صاحب کی شخصیت اور کلام کا بنیادی جزو ہے ؎

آزاد مزاجوں پر اتنا ہوتا ہے غمِ دوراں کا اثر
جیسے کوئی تازہ شاخِ چمن آندھی میں لچک کے رہ جائے

کلامِ فانی کی رنگارنگی، میر کی دردمندی، غالب کی سی فکر و نظر اور زبان و بیان کی انفرادیت اور اقبال کا سا مترنم لہجہ اور سنجیدگی کلامِ فریدی میں جا بجا نمایاں ہے۔ کفرِ تمنّا کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں صرف روایت کا احترام ہی نہیں بلکہ جدّت طرازی کا شعور بھی ہے۔ قدیم و جدید غزل میں بنیادی فرق لفظوں کی تعبیرات و مفاہیم کی جدّت، فکر و نظر اور احساسات کی ندرت ہے۔ کلامِ فریدی میں قدیم تشبیہات و استعارات کا استعمال نئی علامت بن کر ابھرتا ہے جس سے تہذیبی و سماجی اقدار، زمانے کے مزاج اور رُخ کی بھی عکاسی ہوتی ہے اور عہدِ حاضر کے حادثات اور واقعات اور حالات کی ترجمانی بھی ہے ؎

یادگارِ عہدِ گل چاکِ قبا رہ جائے گا پھول کا اک اک ورق بکھرا ہوا رہ جائے گا

ایسی بستی سے تو وہ دشت کہیں بہتر تھا
آبلے مل کے جہاں روتے تھے ہر خار کے ساتھ

ڈاکٹر مغیث الدین فریدی نمبر

رُت بدلتی رہی رنگ اڑتے رہے کم نظر باغباں کم نظر ہی رہے
اک خیاباں کو سیراب کرتے رہے آبروئے بہارِ چمن بیچ کر

تم اس کے فن کی داد دو جو بیچ کر اپنا ضمیر
دربار کی زینت بھی ہے بازار میں رسوا بھی ہے

جہاں اگتی ہے فصلیں خنجروں کی
وہیں بارش بھی ہوتی ہے سروں کی

کفر تمنا میں لفظ جنوں اور آئینہ کی تکرار زیادہ ہے ان کے یہاں جنوں کا احترام اور عظمت ہے لفظِ جنوں ان کے یہاں وسیع اور مخصوص معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جنوں ان کے نزدیک محض دیوانگی یا بیگانگی نہیں بلکہ محویت ہے، وجد و سرور ہے، گرمیِ قلب و نظر ہے۔ جنون کو تہذیبِ جنون کہہ کر نظر کے معجزے سے تعبیر کیا ہے ان کے نزدیک ؏

جنوں کے دم سے ہیں آئینہ ادراک دیوانے

فارسی زبان پر قدرت اور وسیع مطالعہ کے سبب کلام میں جا بجا فارسی تراکیب بھی نظر آتی ہیں لیکن کہیں ثقالت نہیں بلکہ روانی اور تسلسل ہے ان کے یہاں ایک طرف قدیم شعرا کے الفاظ و تراکیب سے استفادہ نظر آتا ہے تو دوسری طرف ان الفاظ سے نئی تراکیب بھی وضع کی ہیں جن میں جدت ہی نہیں ایک خاص قسم کا آہنگ اور ترنم بھی ہے مثلاً بارشِ سنگ شور ملامت، رقصِ شررِ جاں، شمع فانوسِ طلب، حاصلِ کارگرِ شیشہ گراں، میزانِ جنون، حدیثِ لبِ رخسار اور شاہدِ رعنائے حیات، وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عروض کے بہت اچھے پارکھ ہونے کے باوجود کلام میں فنی لوازم کے ساتھ شعریت اور تغزل کی شان ہر جگہ نمایاں ہے فن عروض سے ان کا جذباتی رشتہ ضرور ہے لیکن اسے انھوں نے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ عروض کے ذریعہ انھوں نے لفظ و معنی میں مناسبت، تناسب اور ہم آہنگی کا رشتہ برقرار رکھا ہے اور بڑے خلوص کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھالا ہے "کفر تمنا" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریدی صاحب کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ لفظ کا بھی درجۂ حرارت ہوتا ہے اور اسی حرارت کے مطابق ان کے مفاہیم و معانی اور تعبیرات کا تعین ہوتا ہے۔ الفاظ کا یہ موزوں اور برمحل استعمال کلام فریدی کے قافیوں میں بھی واضح شکل میں نظر آتا ہے۔ کلام میں مخصوص بحر اور زمین کا انتخاب بھی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انتخاب ان کے ذوقِ طبع کا نتیجہ ہے طویل بحر کی غزل بھی اپنے اندر لفظی و معنوی رچاؤ رکھتی ہے اور تاثر بھی دوسری غزلوں کے مقابلہ زیادہ ہی ہے۔ ان بحروں کا آہنگ بھی مترنم ہے جسے الفاظ کے زیر و بم اور حسنِ معنی نے اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے مثلاً ؎

درد کی ہر تڑپ ہے متاعِ گراں راہ میں آئیں کیسے ہی سنگِ گراں
دل ہے زندہ فریدی تو پھر غم نہیں ہر قدم پر نیا امتحاں ہی سہی

دردِ حرف و صدا میں اگر ڈھل گیا بن کے نشتر دلوں میں اتر جائے گا
اس سے پہلے کہ ہونٹوں پہ مہریں لگیں نوکِ خنجر پہ رکھ دو زباں دوستو!

کلام کے متاثر کرنے اور موثر ہونے میں لہجہ کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ فریدی صاحب کے یہاں موضوع اور خیال کی رعایت سے لہجہ میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ ایک ہی غزل میں متضاد لہجے بھی مل جاتے ہیں۔ خیالات و مضامین میں تنوع، مزاج کی بے باکی، طبیعت کی بے نیازی و قلندری اور خلوص و صداقت انہیں اظہار کے موزوں تر سانچے فراہم کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کا لہجہ دردمندانہ ہے لیکن کہیں کہیں خطیبانہ بھی ہے

اب ہاتھ سے رکھ دو جامِ طرب اب نام نہ لو پیمانوں کا
ساغر سے چھلکنے والا ہے اس وقت لہو انسانوں کا

ان کے لہجہ میں دردمندی کے ساتھ خودداری بھی ہے جو عظمتِ انسانی اور سربلندی کو پیش کرتی ہے۔ یہاں وہ فانی سے زیادہ اقبال کے قریب نظر آتے ہیں۔ جگر کی طرح وہ بھی "فیضانِ محبت" سے زیادہ "عرفانِ محبت" کے قائل ہیں۔ آخر میں انہیں کے ایک شعر پر جو غزل اور صاحبِ غزل دونوں کا ترجمان ہے۔ اس خامہ فرسائی کو ختم کیا جاتا ہے۔

حاصلِ فن ہیں فریدی وہی اشعارِ غزل
خونِ دل جن میں ہو رنگینیٔ افکار کے ساتھ

❖

انتخاب تضمین

اور

غزلیات

تضمین

بر غزل مخدوم محی الدین

رنگ لایا ہے مرا دستِ رسا آخرِ شب
رات بھیگی تو کھُلا بندِ قبا آخرِ شب
نشۂ جام طرب تیز ہوا آخرِ شب
بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزا آخرِ شب
اور بھی سرخ ہے رُخسارِ حیا آخرِ شب

داغ لو دینے لگے سینے میں جلتے جلتے
دل بڑھایا ہے غمِ عشق نے مَلتے مَلتے
تیز صہبائے جنوں ہوگئی ڈھلتے ڈھلتے
منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

وضع اربابِ جنوں آج بھی ہے رندانہ
مشربِ عیش سے رہتے ہیں مگر بیگانہ
طلب جام نہ دل کو ہوسِ پیمانہ
کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

کفر و ایماں کی کشاکش سے ملا ہم کو فروغ
دل میں سرشار ہیں جذبات تو روشن ہے دماغ
تارے ڈوبے کہ اُبھرنے لگا خورشید ایاغ
گل ہے قندیلِ حرم گُل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخرِ شب

مشعلیں فکر کی روشن ہیں نظر کے فانوس
شورِ ماتم کا وہ ہنگامہ کہ قاتل مایوس
بانکپن اپنا دکھاتے ہیں یہ خونیں ملبوس
ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا ملبوس
ہم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب

جیسے کل فتنے اُٹھے خواب سے آنکھیں مل کے
رنگ اور نور بہم ہوتے تھے ہلکے ہلکے
اُسی انداز سے پھر پھول کا ساغر چھلکے
اُسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

انتخاب غزلیات

کفر تمنّا

ذہن کو ماؤف کر دیتا ہے لفظوں کا طلسم
مدعا کہہ دیجئے جادو بیانی پھر سہی

اس دورِ تجارت کے دستور نرالے ہیں
آئینے سے تابانی اب آئینہ گر مانگے

ملا کے ہم سے نظر آئینہ ذرا دیکھو
کہاں ملیں گے تمہیں صاحبِ نظر ہم سے

کس سے محنت کا اپنی صلا مانگتے ذرہ ذرہ ہمارا ہی محتاج تھا
دشتِ امکاں کو ہم نے مہک بخش دی جھوم کر آہوئے مشک بو کی طرح

اندازِ سخن مصلحت آمیز بہت ہے
پھر بھی یہ ادا تیری دل آویز بہت ہے
اِک بار بھی تھرّائی نہ لو شمع وفا کی
سنتے تھے زمانے کی ہوا تیز بہت ہے

ہے فریدی عجب رنگِ بزمِ جہاں مٹ رہا ہے یہاں فرق سود و زیاں
نور کی بھیک تاروں سے لینے لگا آفتاب اپنی اِک اِک کرن بیچ کر

اب کسی درد کا شکوہ نہ کسی غم کا گلہ
میری ہستی نے بڑی دیر میں پایا ہے مجھے

کسی نے زبانِ تمنّا نہ سمجھی غلط فہمیوں سے بڑھی بے نیازی
ذرا جس کو چشمِ عقیدت سے دیکھا وہی رفتہ رفتہ خدا بن گیا ہے
ہوا ہلکی ہلکی فضا بھیگی بھیگی یہ پچھلے پہر بھینی بھینی سی خوشبو
مرے دیدہ و دل کا عالم نہ پوچھو کوئی آرزو جیسے محوِ دعا ہے

رفتہ رفتہ یہ قفس بھی آشیاں ہو جائے گا
اور کچھ دن تک قفس کو آشیاں کہتے رہو
تیز ہیں خنجر ابھی بازوئے قاتل شل نہیں
قتل گاہوں کو مگر دار الاماں کہتے رہو

رات محفل میں وہ تھا دیدہ و دل کا عالم
جیسے چلتی ہوئی تلوار سے تلوار ملے

تری اداؤں کی سادگی میں کسی کو محسوس بھی نہ ہو گا
ابھی قیامت کا اک کرشمہ حیا کے دامن میں پل رہا ہے

اک بار اپنے آپ سے ملنے کی حسرت ہے مجھے
ہستی مری اس شہر میں کھوئی ہوئی آواز ہے

زمانہ اس پہ تُلا ہے، خرد کی بات رہے
ہمیں یہ ضد ہے کہ اونچا جنوں کا نام کریں

سنگِ ملامت لے کے تم جس کو چلے ہو توڑنے
اے ناصحو! تم نے کبھی وہ آئینہ دیکھا بھی ہے
طبع فریدی کو کوئی شکوہ زمانے سے نہیں
دنیا میں وہ رہتا بھی ہے دنیا سے بے پروا بھی ہے

ہمیں اس انقلابِ دہر کی دعوت نہ دو جس میں
نہ پھولوں کی مہک بدلے نہ کانٹوں کی چبھن بدلے

پا یہ خوشبو ہے تری یا ہے مرا رنگِ نظر ورنہ اے دوست جہاں گزراں کچھ بھی نہیں

تیر تو سب تمھارے خطا ہو گئے توڑ دو اب یہ خالی کماں دوستو
آؤ بڑھ کر گلے سے لگا لو ہمیں ورنہ پھر تم کہاں ہم کہاں دوستو
کیسے اک دوسرے کو سمجھتے بھلا، گفتگو سے بڑھا اور بھی فاصلا
ہم تھے بے ربط سی داستانِ وفا تم تھے مبہم سا طرزِ بیاں دوستو

ہم نے مانگا تھا سہارا تو ملی اس کی سزا
گھٹتے بڑھتے رہے ہم سایۂ دیوار کے ساتھ

اس دورِ تجارت میں قلم جس نے نہ بیچا
کہ دو یہ فریدی سے وہ فنکار کہاں ہے

ہمارے خاک اڑانے پر نہ جا اے ناصح ناداں
تم دنیا کے سر پر ڈالتے ہیں خاک دیوانے
فریدی ہے وہی شغلِ جنوں بے دست و پائی میں
کیا کرتے ہیں دامانِ تمنا چاک دیوانے

وہ بغیر لفظ کے شرحِ غم جو نظر نے دل کو سنائی تھی
مرے لب پہ اب بھی نہ آسکی تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غرورِ بیکسی نے سی دیے لب گھٹ گئیں آہیں
تمھیں آواز دینا چاہتی تھی میری تنہائی

آغوش میں دل کے یاد تری یوں آئی کہ جیسے کوئی کلی
خود اپنی مہک پر وجد کرے اور جھوم کے خود ہی کھل جائے

بس گئی ہیں اب اس میں بستیاں جمالوں کی
آئینہ تو آیا تھا ان کے روبرو تنہا

دیر تک ساتھ نہ دے گا یہ جہانِ گزراں
محفلِ دہر کو تم آئینہ بن کر دیکھو

شیشۂ مے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں سرِ بزم
پینے والو، مرے بکھرے ہوئے ٹکڑے چُن لو

کبھی بے ارادہ چھلک گئی تھی کسی کے ذکر پہ چشمِ نم
وہ ہیں مجھ سے آج بھی بدگماں وہی ایک بات لیے ہوئے
شبِ انتظار کے بعد پھر نہ ہوئی طلوع کوئی سحر
مری عمر ساری گزر گئی یہی ایک رات لیے ہوئے

دنیا کی بہاروں میں کھو کر میں اپنی نظر سے چھپ جاتا
صد شکر دلِ آگاہ مرا، دل بن گیا جامِ جم نہ ہوا
بکھرے ہوئے تنکے چُن چُن کر تعمیر نشیمن کر تو لیا
تعمیرِ نشیمن سے لیکن احساسِ تباہی کم نہ ہوا

جوشِ جنوں میں شوق کی سادہ دلی تو دیکھیے
منتظرِ کرم ہوں میں عُذرِ جفا کے بعد بھی
طعنۂ دستِ نارسا مجھ کو نہ دے کر تو تو ہے
دسترس طلب سے دور، دستِ رسا کے بعد بھی

مزہ تو یہ ہے جنوں سے ہے آگہی کا بھرم
بہک نہ جاتے تو سب رازِ بہ دیے ہوتے

لب سی دیے تھے پاسِ محبت نے ورنہ رات
دل کھینچ کے آگیا تھا لبوں تک فغاں کے ساتھ

دل توڑ کے ہنس دینے والے دنیا میں فریدی لاکھوں ہیں
جو غیر کا غم بھی اپنا لے اس دہر میں ایسا کوئی نہیں

دیکھنا ہے مجھے اب عشق کی توفیقِ طلب
حسن کے ہاتھ میں ساغر بھی ہے تلوار بھی ہے
منکرِ فنِ غزل تھا جو فریدی اب تک
وہی اس جنسِ گرامی کا خریدار بھی ہے